جلد ۱۰۷ مارچ ۱۹۸۷ء عدد ۱

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مؤسس

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمہ اللہ تعالیٰ

ادارۂ ترجمان القرآن، اچھرہ، لاہور

ڈاکٹر ملک غلام مرتضیٰ اسسٹنٹ پروفیسر و صدر شعبہ ترجمہ

اسلامک یونیورسٹی مدینہ منوّرہ

کی

تصانیف

⊖ — وجودِ باری تعالیٰ اور توحید	۶۰/- روپے
⊖ — رسولِ اکرمؐ کی شادیاں اور ان کا پس منظر	۸/- ″
⊖ — مقصدِ حیات اور اس کا حصول	۸/- ″
⊖ — جرائم کے اسباب (ایک نفسیاتی تجزیہ)	۶/- ″
⊖ — نشہ اور اس کا حتمی علاج (ایک نفسیاتی جائزہ اور عملی تدابیر)	۶/- ″
⊖ — حقیقتِ دعا	۹/- ″
⊖ — توبہ کی حقیقت	۶/- ″
⊖ — احیائے دین کی اساس	۸/- ″
⊖ — اسلام اور محمدؐ پر بہتانات (عربی) انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا میں جہالت اور بغض پر مبنی ۲۴ الزامات اور غلط بیانیوں کا مدلل جواب)	۲۰/- ″
⊖ — ″ ″ ″ ″ (اردو)	۲۰/- ″
⊖ — ″ ″ ″ ″ (انگلش)	۲۰/- ″

ملنے کا پتہ

ادارہ ترجمان القرآن لمیٹڈ - رحمان مارکیٹ - غزنی سٹریٹ - اردو بازار لاہور

فہرست مضامین

جلد ۱۰۷	مارچ ۱۹۸۷ء مطابق رجب ۱۴۰۷ھ	عدد ۱

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵-اے ذیلدار پارک، اچھرہ - لاہور

زرِ سالانہ تیس روپے - فی پرچہ ۳/- روپے

سید حسین فاروق مودودی نے ایچ فاروق ایسوسی ایٹس لمیٹڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اشارات

کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ میرے ضمیر کی گہرائیوں سے ایک دھیمی سی آوازہ اُٹھتی ہے اور پھر وہ صورِ اسرافیل کی طرح حشر انگیز بن جاتی ہے۔ اِس آوازہ کا مخاطب بالعموم میں خود ہی ہوتا ہوں۔ مگر بعد میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ تو میری ساری مقصدی برادری کے لیے متاعِ مشترک ہے تو میں اسے سب تک پہنچانے کے لیے لفظوں کا جامہ پہنا دیتا ہوں۔ میری بات اگر غلط ہو تو مَیں خدا سے بھی معافی مانگتا ہوں، آپ بھی میرے لیے معافی مانگیے، درست ہو تو میں بھی اس پر غور کروں، آپ بھی کیجیے اور ہم سب دُعا کریں کہ خدا اس آوازۂ ضمیر کو باعثِ خیر و برکت بنائے۔

ملک کا سیاسی ماحول سخت تاریک ہے، دینی لحاظ سے دیکھیں تو چاروں طرف سے ضلالت و رذالت کے طوفان اُٹھ رہے ہیں —— اور اپنے آپ کو دیکھیں تو جہاں یہ وجہِ شکر سامنے آتی ہے کہ ہمارے دلوں میں ایمان کی شمع ہنوز جھلملاتی ہے۔ وہاں ہم یہ محسوس کر کے اندوہگیں ہو جاتے ہیں کہ ماحول کی تاریکیوں اور ضلالتوں نے ہم پر قابو نہیں پایا مگر اثرات ضرور ڈالے ہیں۔ یہ احساس تقاضا کرتا ہے کہ اپنے ایمان کو زندہ تر اور اپنے شعور کو بیدار تر کیا جائے۔

بڑے کام کرنے والوں کو ہر وقت تجدیدِ ایمان، تجدیدِ نظریہ اور تجدیدِ شعور کرتے رہنا چاہیے۔ اسی کا نام تذکر ہے، جو مطلوب دین ہے۔ اپنے اُصول و مقاصد کو بار بار سامنے لانا، اپنی روایات و اقدار کے چراغوں کی لَو کم نہ ہونے دینا۔ مخصوص لہجے اور اُصولی کاموں کے لیے یہ ایسی شدید بنیادی ضرورت

ہے کہ یہ اگر بالکل ہی ملحوظ نہ ہو تو سارا کھیل بکھر جائے گا۔ اور اگر اس کا احساس اور اس پر عمل ضرورت سے کم ہو تو چھوٹے چھوٹے انحرافات اور تصرفات خلل پیدا کریں گے اور خود اپنے اندر حالتِ اطمینان باقی نہیں رہے گی۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ بجلی کی رَو یا بیٹری کی پاور کو ٹسٹ کرنے کے لیے یا گاڑی کے پہیوں میں بھری جانے والی ہوا کا دباؤ معلوم کرنے کے لیے، یا کم سے کم درجہ میں ترازو کے دونوں پلڑوں کو برابر رکھنے کے لیے ایک سُوئی یہ دکھاتی ہے کہ صورت درست ہے یا نہیں۔ بعض اوقات اُس سوئی کو آپ تیزی سے اِدھر اُدھر ہوتے، بلکہ لرزتے دیکھتے ہیں۔ دراصل یہ سوئی اگر اپنے مقررہ نشانِ توسط پر رک جائے تو ٹھیک، ورنہ وہ سراپا اضطراب بن جائے گی۔

ایسی ہی ایک سُوئی ہمارے ضمیر کے اندر ایک مخفی ڈائل پر لگی ہوئی ہے۔ آپ جہاں اپنے اُصول و مقاصد اور روایات و اقدار سے ہٹے، یہ سُوئی اِدھر اُدھر ہونے لگتی ہے۔ دوسرے معنوں میں آپ حالتِ اطمینان کھو بیٹھتے ہیں۔ آپ کو اپنے اُوپر، اپنے جادہ و منزل پر، اپنے زادِ راہ پر یہ اطمینان نہیں رہتا کہ آیا یہ سب کچھ ٹھیک ہے۔ اس قسم کی حالتِ بے اطمینانی کا صحیح طریقے سے اگر نہ آدمی خود ازالہ کر سکتا ہو، نہ دوسرے رفیقوں یا اکابر سے مدد لے سکتا ہو یا ایسے احساس مضطرب کو کسی حل کر سکنے والے کے سامنے رکھنے میں جھجک ہوتی ہو، یا وہ بات کسی اہم جگہ کہہ دے تو آگے سے ڈانٹ پڑ جائے، یا ماحول اُس کے ساتھ ہمدردی کرنے پر تیار نہ ہو تو وقت گزرنے کے ساتھ بے اطمینانی کی ظاہری کیفیت تو گزر جائے گی، مگر دل میں ایک زخم چھوڑ جائے گی ـــ اس سے قوتِ عمل کم ہو جاتی ہے۔ پھر اگر ایسے ہی زخم اور لگتے رہیں اور چارہ ساز و دمساز کوئی نہ ہو تو ”من ہمہ داغ داغ“ ہو جاتا ہے اور آدمی کی روش میں اس کے ارادے کے بغیر یاس و جمود کا ایک رنگ پیدا ہو جاتا ہے۔

ذرا یاد کریں ۱۹۴۱ء سے کئی سال بعد تک کا دَورِ رفتہ! ہم بڑا سرمایۂ اطمینان لے کر چلے تھے۔ اپنے نظریات، اپنے طریق کار، اپنی قیادت، اپنی قوتوں، اپنے زورِ استدلال، اپنے دعوتی پھیلاؤ، اپنی پابندیٔ اُصول، اپنے صاف ستھرے کردار اور اپنی مرکزی قیادت کے علاوہ اپنے مقامی امرا اور

ناظمین پر کس درجہ اطمینان تھا۔

مولینا مودودیؒ نے دین و سیاست کو ایسا ہم آہنگ رکھا اور ایک ہی سکّے کے دو رُخ ہونے کی حیثیت سے اس شان سے چلایا کہ جب کبھی اسلامی ریاست کے طے شدہ اُصول و نہج اور پیمانۂ پسند و ناپسند اور اخلاقی حدود سے تجاوز یا پسپائی کی کوئی خفیف سی حرکت بھی کہیں واقع ہوئی تو مختلف اطراف سے مولانا کے سامنے شکایات آنے لگیں۔ مولانا صبر و تحمل سے ہر بات کو سُنتے بلکہ کرید کرید کر دریافت کرتے۔ مجلسِ شوریٰ میں رپورٹیں طلب کرتے۔ انہوں نے کبھی کسی غلط حرکت کو زورِ کلام سے ملبوسِ جواز پہنانے کی کوشش نہیں کی بلکہ ساری معلومات جمع ہونے پر جماعت کی پہلے سے قائم شدہ اُصولی پالیسی کے خطوط زیادہ واضح اور نمایاں کر دیئے۔ اور غلط اقدامات کو مسترد کر دیا۔ پالیسی جب اپنی جگہ پر سیٹ ہو گئی۔ یا دوسرے لفظوں میں آپ کے قدم اُصول کی شاہ راہ پر واپس آ گئے یا روایت کی ٹوٹی ہوئی لکیر بحال ہو گئی تو احساس کی سوئی پھر اطمینان کے نقطۂ اعتدال پر آ کر رُک گئی۔

لیکن اگر خدانخواستہ ایسا ہو کہ چھوٹی چھوٹی بے اطمینانیاں اور بڑی بڑی اطمینانیاں وقتاً فوقتاً پیش آنے لگیں اور اُن کا تدارک نہ ہو سکے، کوئی ایسا مرکزِ محبت نہ ہو جو آپ کے سر اور شانوں پر شفقت کا ہاتھ پھیرتے ہوئے آپ کو صحیح صورت سمجھائے یا آپ کا اُٹھایا ہوا نکتہ صحیح ہونے کی صورت میں شکریہ کے ساتھ اسے قبول کرے تو پھر اندر کے ان چھوٹے چھوٹے زخموں پر کھرنڈ سا جمتا رہتا ہے، مگر بہ درد کرتے ہی رہتے ہیں۔ بے اطمینانی کی زد میں آنے والا آدمی بار بار توجیہیں کر کے کسی بات کو، کسی عمل کو، کسی اقدام کو، کسی اتحاد کو، کسی نعرے کو، کسی کارروائی کو، کسی شخصیت کے رُخِ کردار کو آنکھیں بند کر کے بھی صحیح قرار دیتا ہے، توجیہیں بھی پیدا کرتا ہے، لیپاپوتی کے طریقے بھی اختیار کرتا ہے، اپنے آپ کو فریب بھی دیتا ہے ــــ اور بظاہر وہ پیش آمدہ آزمائش سے بچ نکلتا ہے جو ایک بار تو اُس کے دل و دماغ کو ہلا ڈالتی ہے۔ لیکن خود فریبی مسائل کا حل نہیں ہے۔

آخر ذرا آپ اپنے اندر کا جائزہ لیجیے۔ عشا کے سونے سے پہلے جا نماز پر بیٹھ کر کچھ خدا سے رابطہ کیجیے اور پھر اس سوال پر غور کیجیے کہ آپ کو تحریکی معاملات میں ہر پہلو سے پورا پورا اطمینان ہے؟ اگر نہیں ہے تو کس عقیدے، جذبے یا شعور کی تجدید کی ضرورت ہے؟

بڑے بڑے اجتماعی نصب العین (خصوصاً اسلامی) لے کر چلنے والوں کی زندگیاں اور ان کا پیدا کردہ ذہنی یا سماجی ماحول دوسروں سے زیادہ روشن ہونے چاہییں۔ عمومی فضا محبت و ایثار کی ہونی چاہیے۔ ہر کوئی دوسروں کی قدر کرنے والا اور ان کی ہر تکلیف کا محسوس کرنے والا ہو اور وہ اہتمام کرے کہ اگر وہ کوئی خدمت نہ کر سکے گا تو کسی دوسرے کو کسی طرح کی اذیت بھی اپنی جانب سے نہ پہنچنے دے گا۔

پھر برادرانہ جذبے سے دل اتنے کھلے ہونے چاہییں کہ اگر کسی شخص کے طرزِ عمل پر کوئی دوسرا اعتراض اُٹھائے یا کسی مجلس میں تنقید کرے تو وہ دل میں انتقامی جذبے کی گرہ ڈال کر نہ بیٹھ جائے کہ آئندہ جب کبھی موقع ملے گا، وہ بھی نہلے کا جواب دہلے سے دے گا۔

اِس سے بھی زیادہ ضروری یہ امر ہے کہ ہمارے کارکن جن میں بہت سے اچھی طرح ماہر تکلم نہیں ہوتے، زورِ استدلال سے کام نہیں لے سکتے، ان میں سے کئی دیہاتی ہوتے ہیں جو ضرورت سے کہیں زیادہ اپنے سے بڑوں کا احترام کرتے ہوئے اُن کے سامنے کسی اختلافی نکتے پر زبان کھولنے کی جرأت نہیں کرتے، ہمارا فرض ہے کہ ان سب کو گلے لگائیں اور ان کے غیر ادبی اور سادہ اور کھرے اندازِ بیان پر انھیں ڈانٹنے کے بجائے اُن کے نفسِ مدعا کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ ان سے خود سوال کر کر کے پوری بات معلوم کریں۔ وہ بیچارے تو اپنے اُس درد کو بیان کرنے کے لیے الفاظ اور انداز نہیں پاتے جو اس کانٹے کی وجہ سے ہے جو اُن کے ضمیر میں خلش کر رہا ہے۔ آپ پہلے انھیں دردمند اور دُکھی تو سمجھیے، پھر اُن کی بات سمجھنا آسان ہو جائے گا۔ سوالات، اعتراضات اور تنقید چونکہ اسلامی نظامِ جماعت کی صحت مندی کا لازمہ ہیں، اس لیے ان کے راستے کھلے رہنے چاہییں۔ جب کبھی ان راستوں کو بند کیا جائے گا یا ان کے دروازوں میں بھاری کواڑ لگا کر ان کو مقفل کر دیا جائے گا تو تنظیم کی صحت برقرار نہ رہ سکے گی۔ سوالوں اور اعتراضات کا آرام سے جواب دیجیے۔ اچھے دلائل سے جواب دیجیے۔ مخاطب کا محض منہ بند کرنے والا جواب نہ دیجیے۔ جواب اطمینان دلانے والا ہو۔ اُس کے اطمینان میں جو خلل آیا ہے، اُسے دُور کیجیے۔

تحریکی شعور کی اس لحاظ سے بھی بار بار تجدید کرنی چاہیے کہ اسلامی تحریک کے اصولوں کا اطلاق بڑوں اور چھوٹوں پر یکساں ہونا چاہیے۔ اگر کوئی عام کارکن غلطی کرے یا رکن لغزش کھائے تو جس درجہ کی گرفت اس کے لیے ہے، اُسی درجے کی گرفت ویسی غلطی پر عہدہ داروں اور قائدین کی بھی ہونی چاہیے۔ چھوٹوں پر گرفت کرنا اور بڑوں سے چشم پوشی کرنا ایسا خطرناک طریقہ ہے جس کے لیے رسول اللہ نے سخت وعید سنائی ہے۔

مثلاً جماعت کی کسی معاملے میں مقررہ پالیسی کے ہوتے ہوئے اگر ایک معمولی رکن کو حق نہیں کہ اس سے انحراف کرے یا مقررہ پالیسی میں سے ایک اور شاخ نکال لے تو اُس کے کسی عہدہ دار اور لیڈر کو بھی اس کا حق نہیں۔ جماعت کے کارفرما اداروں اور اشخاص نے کسی شخص یا گروہ کو اسلام، جمہوریت اور امن کا دشمن قرار دیا ہو تو کسی چھوٹے یا بڑے کو یہ جسارت نہیں کرنی چاہیے کہ وہ اپنے گروہ کو اسلام، جمہوریت اور اس کا خادم قرار دے۔ یہ ڈھیل اگر جماعت کے تمام افراد کو دے دی جائے کہ وہ جو اختلافی راہیں چاہیں اختیار کریں۔ اور انھیں جس دائرے میں چاہیں بیان کریں تو ہماری پالیسی مینارِ بابل کا تماشا پیش کرے گی۔ ایسی گنجایش رکھنے سے ایک اصولی و مسلکی جماعت کا تو پورا ڈھانچہ ٹوٹ جائے گا۔

اسی طرح ہماری محکم روایات کا معاملہ ہے، جو شروع سے قائم ہیں۔ اور جن کے بارے میں قرار دادیں اور فیصلے اور بیانات موجود ہیں۔ کن طریقوں کو اختیار کرنا ہے، کن کو نہیں، کن عناصر سے اتحاد ہو سکتا ہے، کن سے نہیں۔ کیا نعرے لگائے جا سکتے ہیں کیا نہیں، مظاہروں میں کیا حرکتیں کی جا سکتی ہیں اور کیا نہیں، روایات کا ایک معلوم و معروف خاکہ موجود ہے جسے ہمارے مخالف بھی جانتے ہیں۔ اسے توڑیں تو ہمارے اصول ٹوٹ جاتے ہیں۔ یعنی یہ خاکہ اصولوں ہی کے عملی انطباق سے نمودار ہوا ہے اور اسے بار بار توڑنا اور بدلنا ہمارے جماعتی و تحریکی تشخص کے لیے ضرر رساں ہے۔

دنیا کی سب سے بڑی بلا تضاد ہے۔ یہ فرد کے خیالات اور طرزِ عمل میں ہو، حکومت میں ہو، تعلیم میں ہو، نظامِ جسمانی میں ہو، ہر جگہ وہ باعثِ فساد ہے۔ خصوصاً تنظیمی ہیئتوں کے لیے تو وہ مہلک ہے۔ ہلکے ہلکے اور دھیمے دھیمے تضاد اس طرح عمل کرتے ہیں جیسے سلو پوائزن۔ اوّلاً خرابیاں آہستہ آہستہ سطح سے نیچے ہی پھیلتی جاتی ہیں۔ پھر جب اپنے نتائج کے ساتھ وہ ظاہر ہوتی ہیں تو ان پر قابو

نہیں پایا جا سکتا۔ عقیدہ اور عمل میں، دعوت اور کردار میں، ذکر و عبادت اور سیاست و معیشت میں جہاں بھی کہیں تضاد کا روگ ہوگا وہ اپنے کرشمے دکھائے گا۔ اور درحقیقت یہ تضادات ہی ہوتے ہیں کہ ماضی اور حال میں، اعلانات اور کارروائیوں میں، بڑوں اور چھوٹوں کے رویّوں میں، ظاہر اور باطن میں، جماعتی پالیسیوں کی تعبیرات میں پہلے دھیمے دھیمے طریق سے کام کرتے ہیں۔ اور پھر زور شور سے۔ اگر پہلے مرحلے میں ان کی روک تھام نہ ہو سکے تو پھر اس تباہ کن طوفان کو کنارے پہ کھڑے ہو کر دیکھنے والے رنج و غم سے دیکھتے ہیں، مگر خون کے آنسوؤں سے بھی اس کو روک نہیں سکتے۔

میرے پیارے ساتھیو! عزیز بھائیو! محترم بزرگو! خدا کے لیے نگاہ رکھو کہ کسی پہلو سے تضادات نہ اُبھرنے پائیں۔ تضادات کا شجرۃ الزقوم ایک دفعہ جڑ پکڑ گیا تو آپ کوئی کام نہ کر سکیں گے۔

اُوپر جن باتوں کا ذکر ہوا ہے ان کے بارے میں یہ بھی جان لیجیے کہ خرابیوں کا حل حقیقی اور مؤثر لیپا پوتیوں سے نہیں ہوا کرتا۔ زخم کا یہ کوئی علاج نہیں ہے کہ آپ نے اس پہ نہایت رنگین ریشمی پٹیاں لپیٹ دیں اور بیان دے دیا کہ یہاں کوئی زخم نہیں ہے۔ گندگی کا ازالہ یوں نہیں ہوسکتا کہ جہاں جہاں وہ سامنے آتے یا کوئی دوسرا آدمی متوجہ کرے۔ آپ وہاں وہاں اخبار کا کاغذ اس پر پھیلا کر کونوں پر پتھر رکھ دیں۔ معاملات کو ہمیشہ صاف طور سے لینا چاہیے۔ آپ کے اسلامی طریقے سے جب کوئی انحراف ہو تو صاف صاف کہیے کہ یہ انحراف ہوا ہے اور کوئی دوسرا توجہ دلائے تو اس کی بات کو مانیے کہ تم نے ٹھیک توجہ دلائی۔ جس کسی نے قدمِ انحراف اُٹھایا ہو اُسے بالمشافہ کہیے کہ صاحب! آپ نے یہ غلطی کی ہے اور ایسی غلطی کی گنجایش ہمارے اصولوں اور روایات میں نہیں ہے۔ پھر ان صاحب کے تعاون سے کسی قطعی اور حتمی فیصلہ تک پہنچیے اور اُس کو ڈیکلیئر کیجیے۔ بے شمار ایسے اختلافی یا نزاعی معاملات پیدا ہو کر پھیلتے رہیں گے، اگر ہم نے ایمانی و اخلاقی جرأت کے ساتھ روک تھام نہ کی۔

ہم دینِ حق کے علمبردار اور شہادتِ حق کے ذمہ دار ہیں۔ ہمیں حق کہنا چاہیے دوسروں کے متعلق بھی، اپنے متعلق بھی۔ کبھی آدھا حق کہہ کر دوسرا آدھا حق چھپا نہ دینا چاہیے۔ اور واقعہ کے کسی

حصے کو لپیٹنا نہیں چاہیے - بلکہ جرأت سے پورا حق کہنا چاہیے، خواہ اس کی زد ہم پر ہی پڑتی ہو -

---

تاریخ میں ایک بڑا تضاد دین وسیاست کا لوگوں نے پیدا کر دیا تھا اور صدیوں کے عمل سے ذہن اس کے اتنے عادی ہوگئے کہ اب اسلامی سیاست کی راہ پر راست روی خود ہمارے لیے سخت مشکل مسئلہ بن رہی ہے - تجربات بڑے تلخ ہیں - کبھی دینداری اور اخلاق کی طرف جھکاؤ ہوتا ہے تو سیاست کی راہیں اتنی تنگ کر دی جاتی ہیں کہ آدمی کے داخلے اور پیش قدمی کی کوئی صورت نہیں رہتی - پھر جب ردِ عمل سیاسی ذمہ داری کی طرف مائل کرتا ہے تو دینی واخلاقی رنگ اس طرح اُڑ جاتا ہے کہ ہماری سیاست گری میں لادینیت پسند جماعتوں کی سیاست بازی کے بالمقابل کوئی امتیازی پہلو باقی نہیں رہتا -

میرا خیال یہ ہے کہ اسلامی سیاست کا کامیاب ترین دَور وہی تھا جس کی زمامِ کار مولانا مودودیؒ کے ہاتھ میں تھی - پھر مارشل لا کے آنے سے سب کچھ تلپٹ ہوا - اور نظم کے علاوہ ذہنی وحدت اور اطمینان کی چولیں ایسی ڈھیلی ہوئیں تو کسی طرح چول سے چول مل ہی نہیں پا رہی ہے -

کسی تفصیل میں جائے بغیر تمام شرکائے تحریک سے عرض ہے کہ سیاست کو دینی سیاست کی صورت دیجیے، اس میں دین اُبھرا ہوا معلوم ہو، آپ دینی مقصد کی طرف بڑھیں - اور کسی دینی نکتے ہی پر اتحاد کریں اور اتحاد ان سے ہی کریں جن سے متعلق جماعت عام طور پر جانتی ہو کہ وہ مخالفِ دین یا فسطائیت پسند یا فاسد نظریات وکردار رکھنے والے لوگ نہیں ہیں -

اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق دے کہ ہم جائے نماز سے کر اسمبلی تک تمام معاملات میں اُصولِ دین اور اخلاقی قدروں اور جماعتی روایات کی پابندی کریں - اور اپنے آپ کو لادین یا بے دین عناصر سے ممتاز رکھنے کا اہتمام کریں -

ہر قسم کے سیاسی جوڑ توڑ اور مہرہ بازیوں کا نام اسلامی سیاست نہیں ہے -

---

ہمارے کام کی ساری اساس خدا پرستی پر ہے۔ کوئی بھی دائرہ، کوئی بھی سرگرمی اور کوئی بھی مرحلہ ہو، اگر خدا سے محبت اور خدا کا خوف کارفرما نہ ہو تو پھر کام نمائشی اور ریائی ہو جاتے ہیں اور نشۂ خود پسندی طاری ہو جاتا ہے۔

کسی معاملے پر غور کرتے ہوئے، مشورہ و بحث کرتے ہوئے، اعتراضات سُنتے اور ان کے جواب دیتے ہوئے، پھر کسی فیصل شدہ صورت پر عمل کرتے ہوئے قدم بہ قدم اور نفس بہ نفس خدا کی محبت کی مشعل بلند رکھنی چاہیے، خدا کے خوف سے لرزنا چاہیے۔ اور خدا کے ذکر سے قوت حاصل کرنی چاہیے۔

ہم لوگ اگر مسجد کی عبادات کے دائرے سے باہر سیاست کے دائرے میں زبان سے دعوے کرتے ہوئے، جوشِ تقریر دکھاتے ہوئے، نعرے بلند کرتے ہوئے، مظاہرے کرتے ہوئے، کسی کی حمایت اور کسی کی مخالفت کرتے ہوئے، کسی سے قُرب بڑھاتے اور کسی سے دُوری پیدا کرتے ہوئے قرآن و حدیث کے تحت جماعت کی رہنمائی کے مقررہ خطوط سے انحراف کر کے لغزش کھاتے ہیں اور اس لغزش کی وجہ سے عوام میں شکایات و اعتراضات یا دبے دبے اضطرابات پیدا کر دیتے ہیں تو یہ محض سیاسی غلطیاں ہی نہ ہوں گی، ایک خدا پرست گروہ کے معیارات کے لحاظ سے گناہ کی تعریف میں بھی داخل ہوں گی۔ امیر جماعت، نظم جماعت یا جماعت کی پالیسیوں سے انحراف، یا بے جا قسم کا اختلاف، یا غلط مقام پر اظہارِ اختلاف اور غلط لہجے میں اظہارِ اختلاف، اور پھر بزبانِ عمل اعلانِ اختلاف اپنوں کے علاوہ مخالفین پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ اور ان عوام کے ذہنوں میں بھی غبار بھرتا ہے جو ہماری دعوت کے مخاطب ہیں۔ بنا بریں ایسی چیزیں خدا کی محبت اور خدا کے خوف کے حلقوں سے سر باہر نکالے بغیر عمل میں آ نہیں سکتیں۔ اور کسی دینی جماعت کے لیے یہ بڑا حادثہ ہے کہ خدا کی محبت اور خدا کے خوف سے آزاد ہو کر بھی کام کیے جانے لگیں۔

ان سطور کا تعلق کسی خاص فرد یا گروہ سے نہیں، بالکل بعض اُصولی اور عمومی امکانات کو سامنے رکھ کر واضح کیا گیا کہ ہمارے راستے میں کہاں کہاں گڑھے آتے ہیں۔ اور کہاں کہاں کانٹے ہیں، جن سے بچ کے نکلنا چاہیے۔

ساتھیو! براہ کرم تنہائی میں خدا سے ملاقات کرو۔ اور جو غلطیاں اپنی اور اپنے ساتھیوں کی عمل میں آئی ہوں، اُن کا اعتراف خدا کے سامنے کرو اور ان کی معافی اور ان سے نجات پانے کے لیے دردمندی

سے دُعائیں کرو۔ اللہ تعالیٰ یقیناً سُنے گا اور آپ کو بھی اور آپ کے ساتھیوں اور اکابر کو بھی اور آپ کی جماعت و تحریک کو بھی حفظ و امان میں رکھے گا۔

یہ بھی اچھی طرح جان لیجیے کہ سچی اور کھری دعوتِ دین کے پھیلاؤ اور اس کی کامیابی کا دار و مدار بھی جس چیز پر ہے وہ دعوت دینے والوں کا انفرادی اور اجتماعی طرزِ عمل ہے اور اس طرزِ عمل کا خدا کی رضا کے مطابق ہونا ہے۔

اور آخری بات یہ ذہن میں رکھیے کہ خدا خوفی کا بھاری تقاضا یہ ہے کہ ہزارہا افراد کی محنتوں اور قربانیوں کے ماحصل کے طور پر جو تحریک ہمیں امانت کے طور پر ملی ہے، اُسے بعد والوں تک صحیح سلامت پہنچانا ضروری ہے۔ اگر اس کا چہرہ مسخ ہو جائے، اس میں انحرافات پیدا ہو جائیں، اس میں رخنے پڑ جائیں اور اس کے اُصولوں، ضابطوں، روایتوں اور اخلاقیات کا ڈھانچہ ہمارے ہاتھوں ٹوٹ پھوٹ جائے تو ایسی عظیم امانت کو ناقص حالت میں بعد والوں تک پہنچانا بھاری جُرم ہے۔

اللہ ہم سب کو اپنی نازک ذمہ داریوں کا گہرا احساس دے اور ان کو پورا کرنے کے لیے عزم اور قوتِ عمل عطا کرے اور ہر قسم کی مداہنت سے بچائے۔

قبل اس کے کہ خدا کے سامنے پہنچ کر ہمارا کھاتہ ہمارے سامنے رکھا ہو اور ہم ایک ایک لفظ اور نعرے اور ایک ایک قدم اور ایک ایک ملاقات اور پالیسی کے ایک ایک موڑ کا حساب دے رہے ہوں آج ہی نہایت احتیاط کا رویّہ اختیار کرنا چاہیے اور خود احتسابی کے ساتھ اجتماعی دائرے میں افہام و تفہیم اور تنقید و بحث کی راہیں کھولنی چاہییں۔

حکمتِ سید مودودیؒ

"میرے ساتھیو!"

(ادارہ)

میں آپ سے جو بات کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ جماعت اسلامی جس غرض کے لئے قائم ہوئی ہے وہ ایک اور صرف ایک ہے اور وہ یہ ہے کہ دنیا میں اللہ کے دین کو پوری طرح سے پوری زندگی میں نافذ کیا جائے۔ اس کے سوا اس جماعت کا اور کوئی مقصد اور نصب العین نہیں ہے۔ جو شخص بھی اس جماعت سے وابستہ ہے، خواہ وہ رکن کی حیثیت سے وابستہ ہو، یا کارکن اور متفق کی حیثیت سے وابستہ ہو، اسے یہ بات کبھی فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ جماعت اسلامی کا اصل مقصد دینِ حق کو مکمل طور سے خدا کی زمین پر غالب کرنا ہے۔ اگر ہم سیاسی کام بھی کرتے ہیں تو اقتدار حاصل کرنے یا دوسری سیاسی اغراض کے لئے نہیں کرتے بلکہ اس غرض کے لئے کرتے ہیں کہ اُن رکاوٹوں کو دور کیا جائے جو دین حق کے قیام میں مانع ہو رہی ہیں اور جمہوری ذرائع سے ملک کے اندر اسلامی انقلاب برپا کرنے کا راستہ ہموار ہو سکے۔ جماعت اسلامی کا یہ مؤقف کیوں ہے اور اپنے اس مؤقف پہ کیوں اصرار ہے کہ وہ جمہوری ذرائع ہی سے اسلامی انقلاب برپا کرنا چاہتی ہے اور وہ غیر جمہوری ذرائع کے استعمال کی کیوں مخالف ہے؟ اس کو میں چند الفاظ میں بیان کئے دیتا ہوں۔

خدا کی قسم ہے اور میں قسم بہت کم کھایا کرتا ہوں، کہ جماعت اسلامی نے یہ جو مسلک اختیار کیا ہے کہ وہ کسی قسم کے تشدد اور توڑ پھوڑ کے ذریعے سے، کسی قسم کی دہشت پسندانہ تحریک کے ذریعے سے اور کسی قسم کی خفیہ تحریک یا سازشوں کے ذریعے سے ملک میں انقلاب

برپا نہیں کرنا چاہتی ، بلکہ خالصتہً جمہوری ذرائع سے انقلاب برپا کرنا چاہتی ہے۔ یہ مسلک قطعاً کسی کے خوف کی وجہ سے نہیں ہے۔ یہ ہرگز اس بناء پر نہیں ہے کہ ہم کبھی کسی ابتلا کے وقت اپنی صفائی پیش کرتے ہوئے یہ کہہ سکیں کہ ہم دہشت پسند نہیں ہیں۔ ہمارے اوپر تشدد یا قانون شکنی کا الزام نہ لگایا جائے۔ یہ بات ہرگز نہیں ہے۔ اصل حقیقت یہ ہے کہ ہمارے پیش نظر اسلامی انقلاب ہے اور اسلامی انقلاب کسی خطۂ زمین میں اس وقت تک مضبوط جڑوں سے قائم نہیں ہوسکتا جب تک کہ وہاں کے رہنے والے لوگوں کے خیالات تبدیل نہ کر دیئے جائیں۔ جب تک لوگوں کے افکار اور ان کے اخلاق و عادات میں تبدیلی نہ لائی جائے اس وقت تک مضبوط بنیادوں پر کوئی انقلاب برپا نہیں ہوسکتا۔ اگر زبردستی کسی قسم کے تشدد کے ذریعے سے، یا سازشوں اور خفیہ ہتھکنڈوں کے ذریعے سے کوئی انقلاب برپا کر دیا جائے تو اس کو کبھی دوام اور ثبات نصیب نہیں ہوتا اور بالآخر اسے کسی دوسرے انقلاب کے لئے جگہ خالی کرنی پڑتی ہے اسی طرح اگر دھوکے بازیوں اور جھوٹ اور افتراء کی مہم کے ساتھ انتخابات جیت کر یا کسی اور طریقے سے حکومت پر قبضہ کر کے کوئی سیاسی انقلاب برپا کر بھی دیا جائے تو چاہے وہ کتنی دیر تک قائم رہے لیکن جب وہ اکھڑتا ہے تو اس طرح اکھڑتا ہے جیسے اس کی کوئی جڑ ہی نہیں تھی۔

یہ امر واقعہ ہے کہ پچھلے چھبیس ستائیس سال کے دوران میں جن لوگوں کے ہاتھ میں بھی اس ملک کا نظام چلانے کے اختیارات رہے ہیں۔ خواہ وہ سیاسی اختیارات ہوں یا معاشی یا تعلیمی اختیارات ہوں۔ انہوں نے اس قوم کے ذہن کو بگاڑنے اور اس کی سیرت و کردار کو تباہ کرنے کی کوشش کی اور اس کو اسلام سے دور سے دور تر کر دیا۔ یہ انہی کی ان مجرمانہ بدا ندیشیوں کا نتیجہ ہے کہ آخر کار مشرقی پاکستان، پاکستان سے الگ ہوا وہاں مسلسل یہ ذہن پیدا کیا گیا کہ بنگالی بولنے والے مسلمان اور ہندو ایک قوم ہیں اور بنگالی نہ بولنے والے دوسری قوم ہیں۔ یہ ذہن وہاں پیدا کیا جاتا رہا ہے۔ لیکن حکومت کی طرف سے کبھی اس کی مؤثر روک تھام نہ کی گئی۔ بلکہ

اس کی حوصلہ افزائی ہی کی گئی۔ میں کہتا ہوں کہ یہ قطعی کافرانہ ذہن تھا جو وہاں پیدا کیا گیا ہے۔ اسلامی ذہن تو یہ ہے کہ عربی بولنے والا اگر خدا اور رسولؐ کو نہیں مانتا تو کافر ہے۔ ہمارا مخالف ہے، ہمارا دشمن ہے اور ہمارے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کے برعکس اگر کوئی چینی یا جاپانی یا جرمنی بولنے والا ہے لیکن اسلام کا قائل ہے اور خدا اور رسولؐ کو مانتا ہے تو وہ مسلمان ہے اور ہمارا بھائی ہے۔ رسولؐ اللہ کا چچا ابولہب دشمن تھا اور بلال حبشیؓ اور صہیب رومیؓ اور سلمان فارسیؓ حضورؐ کے دوست اور بھائی تھے تو اسلام کے نام پہ قائم ہونے والے اس ملک کے ایک حصّے میں خالص کفر پھیلایا جاتا رہا لیکن یہاں برسرِاقتدار آنے والے لوگ ہمیشہ خاموش تماشائی بنے رہے اور اس کے نتیجے میں آخرکار مشرقی پاکستان الگ ہو کر رہا اور اب یہاں بھی اسی کفر کو پھیلانے کی کوشش کی جا رہی ہے۔ یہاں لوگوں کے اندر یہ ذہن زبردستی پیدا کیا جا رہا ہے کہ یہاں کوئی پٹھان ہے اور کوئی بلوچ، کوئی سندھی اور کوئی پنجابی۔ کیا یہ پاکستان کی بنیاد تھی؟ قیامِ پاکستان کی جدوجہد میں تو سارے ہندوستان کے مسلمان یہ بھول گئے تھے کہ ہم کون ہیں؟ ان کے پیشِ نظر صرف یہ تھا کہ ہم اول و آخر مسلمان ہیں۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے جب انہوں نے مل کر کوشش کی اور متحد ہو کر پاکستان کا مطالبہ کیا۔ تب پاکستان وجود میں آیا۔ ورنہ اس بات کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اگر گجراتی اور مدراسی اور ملیباری اور سندھی اور پٹھان اور پنجابی سب کے سب الگ الگ قومیتوں کا تصور رکھتے تو پاکستان کبھی نہ بن سکتا۔ اور اب یہاں پھر الگ الگ قومیتوں کا جو تصور پھیلایا جا رہا ہے۔ یہ لازماً پاکستان کے ٹکڑے اڑانے والا ہے۔ سندھ میں آپ دیکھ رہے ہیں کہ بعینہٖ مشرقی پاکستان کی سی صورتحال پیدا کی جا رہی ہے۔ سندھ کا عام مسلمان نہایت سیدھا سادا مخلص مسلمان ہے لیکن وہاں کے تعلیم یافتہ طبقے میں یہ خالص کافرانہ تصور پھیلایا جا رہا ہے کہ سندھی بولنے والا ہندو اور مسلمان ایک قوم ہے اور جو سندھی نہیں بولتا وہ چاہے مسلمان ہو وہ دوسری قوم ہے۔ اسی طرح کی کوششیں دوسرے صوبوں میں بھی جاری ہیں۔ اس طرح ایک طرف تو لوگوں کے نظریات کو بگاڑنے اور ان کے اندر افتراق و انتشار کے بیج بونے کی کوشش کی جا رہی ہے اور دوسری طرف ان کے اخلاق کو بگاڑنے کے لئے تمام ممکن ذرائع استعمال کئے جا رہے ہیں، تیسری طرف تعلیم کا ایسا نظام رائج کیا جا رہا ہے جس سے ایک نوجوان کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ

اسے اسلامی نظام چلانے کے لئے تیار کیا جا رہا ہے یا سوشلسٹ نظام چلانے کی تربیت دی جا رہی ہے یا سرے سے اسے کوئی نظام بنانے اور چلانے کے لئے بھی تیار کیا جا رہا ہے یا نہیں۔ اس طرح کی ایک بگڑی ہوئی صورت حال آپ کے گرد و پیش میں پیدا کی جا رہی ہے اس حالت میں آپ کو جان مار کر کوشش کرنی ہے اور اس غرض کے لئے اپنی پوری طاقت صرف کرنی ہے کہ عام لوگوں کے اندر زیادہ سے زیادہ اسلامی ذہن پیدا کریں۔ کیونکہ جب تک آپ یہ کام نہیں کریں گے۔ اس وقت تک یہاں اسلامی انقلاب کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکے گا۔

اب یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب یہاں جمہوریت کو کبھی چلنے نہیں دیا گیا اور جمہوری طریقوں سے صالح تغیر کا راستہ قریب قریب بند کر دیا گیا ہے اور اگر یہاں کبھی انتخابات ہوئے بھی ہیں تو وہ انتہائی بے ایمانیوں اور بددیانتیوں کے ذریعے سے جیتے جاتے رہے ہیں اور ایسے حالات بھی یہاں پیدا کر دیئے گئے ہیں کہ اگر مفروضے کے طور پر ہم انتخابات میں کبھی سو فیصد ووٹ حاصل کر بھی لیں تو صندوقچیوں سے سو فیصد ووٹ ہمارے خلاف ہی برآمد ہوں گے تو ایسی صورت میں جمہوری ذرائع سے اصلاح احوال کی کیا توقع کی جا سکتی ہے؟ ــــــ یہ صورتِ حال فی الواقع یہاں موجود ہے لیکن ہمیں اس کا مقابلہ کرنا ہے۔ ہمیں اس صورتحال کو بدلنے کے لئے پوری پوری جدوجہد کرنی ہے۔ ہمیں اس غرض کے لئے سرتوڑ کوشش کرنی ہے کہ جن لوگوں کے ہاتھوں سے یہ کام لیا جا رہا ہے ان کے ذہنوں کو تبدیل کیا جائے۔ ہمیں اس امر کی کوشش کرنی ہے کہ ہماری انتھک محنتوں کے نتیجے میں انسانوں کا سیلاب اس طرح انتخابات کے مراکز پر امڈ کر آئے کہ اگر کوئی شخص بے ایمانیاں کرنا بھی چاہے تو نہ کر سکے۔ انقلابی تحریکوں کی زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب لوگوں کے اندر ان کے پھیلائے ہوئے خیالات اس قدر مضبوطی سے جم جاتے ہیں اور ان کے اندر ایک ایسا عزم راسخ پیدا ہو جاتا ہے کہ پھر اس کے بعد کوئی طاقت ان کے مطلوبہ نظام کو آنے سے نہیں روک سکتی۔ وہ ہر راستے سے آتا ہے۔ اور ایسے راستوں سے آتا ہے جن کو بند کرنے کا خیال بھی کبھی کسی کے دماغ میں نہیں آسکتا اس لئے آپ اس بات کی فکر نہ کریں کہ آپ جس نظام کے لئے جدوجہد کر رہے ہیں۔ وہ

وہ یہاں کیسے آئے گا۔ آپ کا اصل کام یہ ہے کہ اپنا فرض نہایت خلوص اور جانفشانی کے ساتھ ادا کرتے چلے جائیں اور آپ کی واحد فکر آپ کا وہ کام ہو جسے آپ کو انجام دینا ہے۔ یہ کام آپ صرف اسی صورت میں دے سکتے ہیں جبکہ آپ کے اپنے اخلاق اس سانچے میں ڈھلے ہوئے ہوں جو اس نظام کا تقاضا ہے۔ جب آپ اسلام کی طرف دعوت دینے کے لئے اٹھیں گے تو لوگ یہ دیکھیں گے کہ ہمیں یہ دعوت دینے والے خود کیسے ہیں۔ اگر آپ کے اخلاق اور سیرت و کردار میں کوئی خرابی ہوئی یا آپ کے اندر ایسے لوگ پائے گئے جو مناصب کے خواہش مند اور ان کے لئے حریص ہوں یا آپ کے اندر ایسے لوگ موجود ہوئے جو کسی درجے میں بھی نظم کی خلاف ورزی کرنے والے ہوں تو اس صورت میں آپ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔ اس لئے یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لیجیے کہ اسلامی انقلاب کے لئے جدوجہد کرنے کے کچھ مخصوص تقاضے ہیں۔ اسلامی نظام کے قیام کی جدوجہد کرتے وقت آپ کو جن چیزوں کو خاص طور پر پیش نظر رکھنا ہو گا وہ یہ ہیں:

آپ کے اخلاق نہایت بلند ہوں، آپ کی زندگی پوری طرح اسلام کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہو، آپ کے اندر نظم جماعت کی کامل اطاعت پائی جاتی ہو۔ آپ جماعت کے دستور کی پوری طرح پابندی کرنے والے ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ آپ عوام الناس کے اندر پھیل کر زیادہ سے زیادہ لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانے کے لئے ہر لحظہ کوشاں ہوں۔ اور چاہے یہ کام آپ کو پچاس سال بھی کرنا پڑے لیکن آپ لگن کے ساتھ اسے کرتے چلے جانے کا مصمم ارادہ رکھتے ہوں تو انشاء اللہ کوئی طاقت اس ملک کو اسلامی ملک بننے سے نہیں روک سکے گی۔

(خطاب بہ اجتماع ارکان - ۳۱ مارچ ۱۹۷۴ء)

مولانا مسعود عالم ندویؒ کا ایک نادر مکتوب

مکتوب الیہ: شیخ نذیر حسین (دائرۂ معارف اسلامیہ)

شیخ نذیر حسین صاحب ہمارے خاص محب و مشفق ہیں۔ ان کا علمی و ادبی مقام بہت بلند ہے۔ موصوف نے اس خط کو "علمی تبرک" کا درجہ دیا۔ انہوں نے مولانا مسعود عالم ندویؒ کی خدمت میں کچھ سوالات بھیجے تھے، یہ خط ان کا جواب ہے۔ اس کے پڑھنے سے عربی زبان کے اساتذہ و طلبہ کو بہت فائدہ ہوگا۔ ہم شیخ صاحب کے بہت شکر گذار ہیں کہ انہوں نے ماضی کی ایک علمی امانت کو آج دنیائے علم کے حوالے کر دیا۔ (مدیر)

نقلِ خط

مکرمی[1] و محترمی۔ السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ،

عنایت نامہ ملا۔ کچھ مصروفیات اور حالات ایسے رہے کہ جلد جواب نہ دے سکا ——— آپ اپنی تعلیم کے لیے "مولوی حضرات" کی طرف نہ دیکھیے اور نہ آپ ان کے محتاج ہیں۔ جتنی کچھ آپ کی تعلیمی حیثیت ہے اس کے بعد صرف مختصر سی رہنمائی حاصل کر کے آپ خود مطالعہ کرتے جائیں۔ انشاء اللہ آپ سے آپ راہیں کھلتی جائیں گی۔

دلائل الاعجاز کوشش کر کے آپ خود ہی پڑھتے جائیں۔ مختصر المعانی کبھی نہ دیکھیں۔ اس کے بجائے ناصف الیازجی کی مختصر سی تالیف مجموع الادب مفید رہے گی۔ تلخیص المفتاح بھی مناسب

[1] بنام شیخ نذیر حسین، مدیر اردو سائیکلوپیڈیا آف اسلام، پنجاب یونیورسٹی، لاہور۔

ہے، لیکن یہ ذرا قدیم طرز کی کتاب ہے اس لیے کچھ پڑھنے میں دقت ہوگی۔

ہمارے اصولِ تعلیم سے واضح ہو سکتا ہے کہ ہم کیا کیا اور کس حیثیت سے پڑھانے کے حامی ہیں۔

ابتدائی ریڈروں کے بعد طالب علم کو ایسی چیزیں پڑھائی جائیں جس سے اس کو زبان سے لگاؤ پیدا ہو۔ اس سلسلے میں مجموعۃ من النظم والنثر للحفظ والتسمیع۔ مصر کے ثانوی مدارس کی نصابی کتاب اور علی میاں کی مختارات من ادب العرب مفید رہے گی۔ اور بھی مجموعے ہیں جن سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

اس کے بعد ابن المقفع کی کلیلہ ودمنہ وہ بہترین کتاب ہے جو عربی ادب میں سہل ممتنع کی حیثیت رکھتی ہے۔ کتاب الاغانی بھی اس سلسلے میں اچھی کتاب ہے۔ یہ بہت ضخیم اور اکیس جلدوں میں ہے اس کے اقتباسات وفات الثالث المثانی فی روایات الاغانی کے نام سے انطون صالحانی الیسوعی نے شائع کئے ہیں جو مطالعہ کے لیے مفید ہیں۔

اس سے آگے بڑھ کر البیان والتبیین للجاحظ، الامالی، للقالی اور الکامل للمبرد اور مقدمہ ابن خلدون ادبی ذوق پیدا کرنے کے لیے اچھی کتابیں ہیں۔

اس کے بعد (CLASSIES) میں حماسہ، متنبی اور جو چاہیں پڑھ لیں۔

زیادہ مفصل نہیں لکھ سکا۔ تاہم یہ تصریحات آپ کے لیے مفید ثابت ہو سکتی ہیں۔

اپنے حالات سے مطلع فرماتے رہیے۔ کل میں کراچی جا رہا ہوں۔ غالباً ۲۰/ نومبر تک واپسی ہو۔ امید ہے کہ مزاج بخیر ہوگا۔

آپ نے نحو کے بارے میں بھی پوچھا ہے۔ کافیہ آپ قطعاً نہ پڑھیں۔ الفیہ ابن عقیل، دیکھ سکتے ہیں۔ اس سلسلہ میں اچھی کتاب شرح شذور الذہب لابن ہشام ہے۔ جو اگر طبع جدید مل جائے جو محمد محی الدین کے اہتمام سے چھپی ہے تو زیادہ مفید رہے گی۔

آپ کا مزاج عالی بخیر ہوگا   والسلام

عاجز

بقلم طٰہٰ یٰسین   مسعود عالم ندوی

مرسلہ: شیخ نذیر حسین، مدیر اردو انسائیکلو پیڈیا آف اسلام، پنجاب یونیورسٹی، لاہور۔

قرآن حکیم اور محروم طبقات

جناب میر محمد حسین صاحب ایم اے - فاضل دیوبند

(۳)

فقراء و مساکین معاشرے کے ان محروم طبقوں میں سے ایک طبقہ ان لوگوں کا بھی ہے، جن کے پاس وسائلِ معیشت ان کی بنیادی ضروریات سے بھی کم ہوتے ہیں - محرومین کے اس طبقہ کے متعلق قرآنِ حکیم کا رویہ کیا ہے - یہ معلوم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم پہلے یہ دیکھیں کہ دولت اور دولت مندوں کے متعلق اس کا نقطۂ نظر کیا ہے - اس میں کوئی شک نہیں کہ دولت کو قرآن مجید میں بعض مقامات پر فضل اور خیر سے تعبیر کیا گیا ہے اور واقعۃً اس کے فضل و خیر ہونے میں اس وقت کوئی شبہ نہیں رہتا جب اس کا اکتساب بھی صحیح طریقوں سے ہو اور اس کا انفاق بھی صحیح مصارف پر - تاہم قرآنِ حکیم نے یہی بتایا ہے کہ عملاً دولت سے اکثر و بیشتر انسانی طبائع میں غفلت، سنگ دلی، استغنا، استحقار، استہزا، بخل، قبولِ حق سے انکار، ارتکابِ جرائم و معاصی جیسے امراض پیدا ہوتے ہیں - مشتے نمونہ از خروارے -

۱ — اما من بخل واستغنیٰ وکذب بالحسنیٰ فسنیسرہ للعسریٰ (الیل)

۲ — ان الانسان لیطغیٰ ان راٰہ استغنیٰ (العلق)

۳ — انھم کانوا قبل ذالک مترفین وکانوا یصرون علی الحنث العظیم - (الذاریات)

۴ — ان کان ذا مال وبنین اذا تتلیٰ علیہ اٰیتنا قالوا ھٰذا اساطیر الاولین - (القلم)

۵ — الھٰکم التکاثر حتی زرتم المقابر (التکاثر)

۶ ــــ بل قلوبهم في غمرة من هٰذا ولهم اعمال من دون ذٰلك هم لها عاملون حتىٰ إذا اخذنا مترفيهم بالعذاب اذا هم يجئرون -

۷ ــــ فذالك الذي يدع اليتيم ولا يحض على طعام المسكين ...... ويمنعون الماعون - (الماعون)

۸ ــــ قالوا لم نك من المصلين ولم نك نطعم المسكين - (المدثر)

۹ ــــ وذرني ومن خلقت وحيدا وجعلت له مالاً ممدوداً ...... كلا انه كان لاٰياتنا عنيداً (المدثر)

انبیائے کرام کو جھٹلانے والے اور ان کی دعوت سے انکار کرنے والے عموماً یہی سرمایہ دار ہوتے ہیں ۔ قرآن حکیم کہتا ہے:

۱ ــــ ذرني والمكذبين اولي النعمة - (المزمل)

۲ ــــ وما ارسلنا في قرية من نذير الا قال مترفوها انا بما ارسلتم به كفرون وقالوا نحن اكثر اموالاً واولاداً وما نحن بمعذبين -

۳ ــــ كلوا وتمتعوا قليلاً انكم مجرمون - (المرسلات)

سرمایہ داری کے ان اثراتِ بد کو بیان کرنے کے ساتھ ساتھ چند سرمایہ داروں کا ذکر جس انداز میں کیا ہے ، اس کا حال بھی سُن لیجیے ۔ فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کو یہی کہہ کر ٹھکرایا تھا کہ میں مصر کے تمام وسائلِ معیشت کا مالک اور یہ مدعی نبوت بھوکا اور کنگلا ۔ بھلا میں اس کی اطاعت کیسے قبول کر لوں ۔

قال يٰقوم اليس لي ملك مصر وهٰذه الانهار تجري من تحتي افلا تبصرون -

قارون بھی اسی کا ایک درباری تھا جس کے پاس مال و دولت کے وہ انبار تھے کہ بقول قرآن اس کے خزانوں کی چابیاں اُٹھانے کے لیے بھی ایک جتھا چاہیے تھا ۔ مگر وہ یہ دولت عوام پر خرچ کرنے کے لیے تیار نہ تھا ۔ وہ کہتا تھا کہ اس میں خدا کا کیا دخل اور عوام کا کیا حق ہے ۔ یہ تو میں نے اپنی لیاقت سے حاصل کی ہے ۔ انما اوتيته على علم عندي - (القصص)

پھر ایک باغ والے (گویا جاگیردار) کا ذکر کیا کہ وہ اپنی دولت کے نشے میں قیامت ہی سے

منکر تھا۔ وہ اپنے غریب ساتھی سے کہتا تھا کہ اول تو قیامت ویامت کوئی شے نہیں۔ اور اگر بالفرض ہوئی بھی تو میں وہاں بھی تم سے اچھا رہوں گا:

وما اظن الساعة قائمة ولئن رددت الی ربی لاجدن خیراً منها منقلبا۔ (الکھف)

گویا دولت نے اس کے ذہن میں یہ بات بٹھا دی تھی کہ وہ اپنی صلاحیتوں اور استحقاق کی بنا پہ وہاں بھی آسودگی اور خوش حالی کا اسی طرح مستحق ہے جس طرح یہاں پہ۔ اور غریب جس طرح یہاں محروم ہے وہاں بھی ایسا ہی رہے گا۔ حضرت شعیب علیہ السلام کی سرمایہ دار کاروباری قوم نے ان سے کہہ دیا تھا کہ تمہاری ان نمازوں وغیرہ کا ہمارے کاروبار سے کیا واسطہ، ہم ہر قسم کی پابندی سے آزاد معیشت کے مالک ہیں:

اصلوتك تامرك ان نترك ما یعبد اباؤنا او ان نفعل فی اموالنا ما نشاء۔ (ھود)

قوم عاد اتنی سرمایہ دار تھی کہ ہر پُر فضا مقام پر بلا ضرورت کوٹھیاں اور محلات تعمیر کر رکھے تھے، جن میں ہر وقت دادِ عیش دیتے رہتے تھے:

اتبنون بکل ریع آیة تعبثون۔ (الشعراء)

اسی افراطِ دولت نے ان کو تکذیب پیغمبر پہ اُکسایا جس کے نتیجے میں انہیں ہلاک کر دیا گیا۔

فکذبوہ فاھلکناھم ان فی ذلك لآیة (الشعراء)

افراد و اقوام کے ذکر کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے ان بستیوں کا بھی ذکر کیا ہے جن کو ذرائع پیداوار کی کثرت نے اس قدر مدہوش کر دیا کہ خدا کے باغی بن گئے۔ اور انجام کار تباہی سے دوچار ہوئے۔ ان کی سونا اُگلنے والی زمین جھاڑ اور ببول اُگانے لگی۔

وکم اھلکنا من قریة بطرت معیشتھا۔ (القصص)

قرآن حکیم تو یہاں تک کہتا ہے کہ قوموں اور بستیوں کی تباہی کا باعث یہ سرمایہ دار ہی بنتے ہیں کیونکہ فسق و فجور کے امام و لیڈر بن کر پوری قوم کو کردار کے بحران میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ ارشاد خداوندی ہے: واذا اردنا ان نھلك قریة امرنا مترفیھا ففسقوا فیھا فحق علیھا

القول فدمرنٰها تدمیرًا (بنی اسرائیل)

اور آخر میں یہ بھی سن لیجیے کہ قرآنِ حکیم کا یہ لرزا دینے والا فرمان بھی سرمایہ داروں ہی کے بارے میں ہے کہ:

الذین یکنزون الذہب والفضۃ و لا ینفقونہا فی سبیل اللہ فبشرہم بعذاب الیم۔ (التوبہ)

دولت اور دولت مندوں کے اس "ذکرِ خیر" کے بعد آئیے اس طبقہ کی طرف جنہیں قرآن حکیم فقراء و مساکین کے نام سے یاد کرتا ہے۔ سب سے پہلے یہ دیکھیے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس فقر و مسکنت سے نکالنے کا کیا اہتمام کیا ہے۔

۱۔ دولت پر زکوٰۃ لازم کی تو اس کا اوّلین مصرف انہی کو قرار دیا: انما الصدقات للفقراء والمساکین۔ (التوبہ)

۲۔ مالِ غنیمت اور فئے وغیرہ میں ان کا حصہ رکھا: واعلموا انما غنمتم من شیءٍ فان للہ خمسہ وللرسول ولذی القربٰی والیتامٰی والمساکین۔ (الانفال)

۳۔ زکوٰۃ و صدقاتِ واجبہ کے علاوہ بھی اغنیاء کے اموال میں ان کا حق ٹھہرایا: فی اموالھم حق للسائل والمحروم۔ لفظ حق کو خاص طور پر نوٹ کریں کیونکہ حق وہ ہوتا ہے جو واجب الادا ہو۔

۴۔ اغنیاء کو انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب دینے کے لیے رکوع کے رکوع وقف کر دیئے۔ بلکہ یہاں تک کہہ دیا کہ: لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون کہ جب تک تم خدا کی راہ میں مخلوق کو اپنی محبوب ترین اشیاء نہیں دے دیتے، تمہارے نکوکاری کے دعوے غلط ہیں۔ انفاق فی سبیل اللہ کی تاکید کے ساتھ ساتھ انہیں متنبہ کر دیا گیا کہ اگر انہوں نے ان فقراء و مساکین پر احسان دھرنے یا ان صدقات کی آڑ میں انہیں ذہنی و جسمانی اذیت دینے کی کوشش کی یا انہیں گھٹیا قسم کی اشیاء دے کر حاتم کی قبر پر لات مارنا چاہی تو سارے کئے دھرے پر پانی پھر جائے گا۔ مقصد یہ تھا کہ فقراء و مساکین کی عزتِ نفس مجروح نہ ہو۔ اگرچہ اسلام کسی کے سامنے دستِ سوال دراز کرنا پسند نہیں کرتا۔ لیکن قرآن نے انہیں صراحت کے ساتھ منع نہیں

کیا ناکہ ان کے دل نہ دکھیں۔ صرف اشارے کنائے سے سمجھایا ہے۔ اغنیاء کو تنبیہ کر دی گئی کہ اگر کسی تہی دست کو تم سے کام آپڑا ہے تو ماتھے پر تیوری چڑھا کر یا اُسے جھڑک کر اُس کے آبگینۂ دل کو ٹھیس نہ پہنچاؤ۔ واما السائل فلا تنھر۔ (الضحیٰ)

۵۔ اللہ تعالیٰ کو فقراء و مساکین کی بہبود کس قدر محبوب و مقصود ہے، اس کا اندازہ سورۂ بقرہ کی اس آیت سے کیجیے جس میں لوگوں کے اس سوال کا ذکر ہے کہ وہ کیا خرچ کریں؟ حضورؐ کو حکم دیا جاتا ہے کہ ان سے کہو جو کچھ بھی تمہاری ضروریات سے فاضل ہو، وہ ان پر خرچ کرو:
ویسئلونك ماذا ینفقون قل العفو۔ (البقرۃ)

۶۔ اور سب سے اہم بات یہ ہے کہ اقتصادیات کے دو ایسے زریں اُصول وضع کر دیئے ہیں جن سے ارتکاز دولت کے سارے سوتے ہی خشک ہو جائیں۔ اور دولت کا بہاؤ تیز بھی ہو جائے اور کثیر الاطراف بھی۔ پہلا اُصول یہ بتایا کہ تمہارا معاشی نظام ایسا ہونا چاہیے کہ کَیۡ لا یکون دولۃ بین الاغنیاء کہ دولت ہیر پھیر کر صرف چند سرمایہ داروں کے ہاتھ میں جمع نہ ہوتی رہے اور دوسرا اُصول یہ بتایا کہ انفقوا مما جعلکم مستخلفین فیہ۔ کہ تم اپنی دولت کے ایسے مالک نہیں جو مختارِ مطلق ہو، بلکہ اس پر خدا کے امین ہو، اس کی مرضی کے مطابق اس کی محروم مخلوق پر تقسیم کرنی پڑے گی۔

سارے قرآن کو پڑھ جایئے۔ سرمایہ داروں کے ذکر کے برخلاف آپ کو کسی ایک محروم انسان کے کردار کی مذمت نہیں ملے گی، حالانکہ ان میں بھی ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی کوتاہیوں کو مجبوریوں پر محمول کرتے ہوئے ان کو نظر انداز کر دیا ہے یا اُن کا ذکر کر کے اللہ تعالیٰ نے ان کے احساسِ محرومی پر نمک پاشی کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ اس کے برعکس قرآنِ حکیم نے ایک خاص واقعہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ریکارڈ کر دیا۔ اور فقراء و مساکین جتنا چاہیں اس پر فخر کر سکتے ہیں کہ ایک فقیر و مسکین شخص —— عبداللہ بن ام مکتوم —— سے اعراض برتنے اور نام نہاد بڑوں پر زیادہ توجہ دینے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب پیغمبر پر بھی اظہارِ خفگی فرمائی۔

ہماری آبادی کا بیشتر حصہ انہی فقراء و مساکین پر مشتمل ہے کیونکہ فقہاء اور ائمہ لغت کے نزدیک

فقیر وہ ہے جس کے پاس وسائلِ معیشت ہوں لیکن ضرورت سے کم ہوں اور مسکین وہ ہے جس کے پاس سرے سے کوئی ذریعہ معاش نہ ہو یا بالعکس اور ہمارے عوام کی اکثریت انہی دو کی ذیل میں آتی ہے۔ قرآنِ حکیم کا اسلوب پکار پکار کر بتا رہا ہے کہ اس کا رجحان کس طرف ہے۔ ہمارے علماء، سیاسی جماعتوں، رہنماؤں، ملکی معیشت کی منصوبہ بندی کرنے والوں کو چاہیے کہ قرآن حکیم کے نور کو پہچانیں، اس کے اشاروں کو سمجھیں اور اپنے سیاسی منشور یا ملک کے میزانیے تیار کرتے وقت ان فقراء و مساکین کی فلاح و بہبود اور ان کی آسودگی و خوش حالی کو زیادہ سے زیادہ اہمیت دیں۔ ملک کے لیے ایسا نظامِ معیشت وضع کریں جس سے قرآنِ حکیم کا یہ مقصد پورا ہو۔ ایسا اقتصادی ڈھانچہ جس میں ایک ہی شخص پہلے ایک جاگیردار کی حیثیت سے آدھے پاکستان کا مالک بنے اور اپنے مزارعین کا خون چوس کر پھر درآمد برآمد پر قابض ہو جائے اور اس سے کماتے ہوئے منافع سے کارخانے پر کارخانے لگاتا چلا جائے اور آخر کار اپنی بے پناہ دولت کے زور پر لوگوں کے ووٹ خرید کر حکمران کی حیثیت سے پورے ملک کے وسائلِ معیشت پر قابض ہو جائے۔ اور اس طرح دولت ہر طرف سے ہر پھر کر اسی کی تجوریوں میں جمع ہونے لگے۔ (ایسا اقتصادی ڈھانچہ) کَیْ لَا یَکُوْنَ دُوْلَۃً بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ کی صریحاً ضد اور روحِ قرآن کے سراسر خلاف ہے۔

بے شک اسلام طبقاتی کش مکش کا قائل نہیں لیکن آپ نے سطورِ بالا سے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ اس کا جھکاؤ کس طرف ہے۔ اس لیے اگر اس دور میں جب کہ معیشت نے غیر معمولی اہمیت اختیار کر لی ہے اور نوبت کَادَ الْفَقْرُ اَنْ یَّکُوْنَ کُفْرًا تک آ پہنچی ہے۔ قرآنِ حکیم کے اس رویہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان محروم طبقوں کے مفاد کو اوّلیت دیں تو یہ اسلام کی بہت بڑی خدمت ہوگی۔ کیا فقراء و مساکین کو ہمیشہ کے لیے فقراء و مساکین رہنے دینا ہی اسلام ہے ——
ہرگز نہیں۔ نہ یہ اسلام ہے اور نہ منشائے قرآن کے مطابق۔

یہ بات بھی علمائے کرام اور مفکرینِ اسلام کے سوچنے کی ہے کہ قرآن حکیم کے ان احکام اور ان کی تفصیل و تبیین میں آنے والے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کو جنہیں ہم اب تک صرف اخلاقیات کی ذیل میں شمار کرتے رہے ہیں، قانون کی صورت دی جائے —— ارتکازِ دولت اور تکاثر کا صدیوں پرانا مرض محض وعظوں اور اخلاقی اپیلوں سے دور نہیں ہوگا۔

قرآن و سنت کی اس سپرٹ کو مدنظر رکھتے ہوئے ایسے ضوابط مدوّن ہونے چاہئیں جن سے یہ تقاضے پورے ہوں تاکہ خدا و رسول کے احکام صرف کتابوں کی زینت بن کر نہ رہ جائیں۔ خدام و عمال کو وہ معاشرے میں کارفرما بھی نظر آئیں۔ اسلامی شریعت کے ان تقاضوں کو پورا کرنے کے بعد اگر کوئی آجر انہیں مزید سہولتیں اور آسائشیں مہیا کرتا اور ان کے ساتھ بھائیوں کا سا سلوک کرتا ہے تو یہ اس کا حسنِ اسلام ہوگا، لیکن ارتکازِ دولت کو کم سے کم کرنے اور فقراء و مساکین کو خوش حالی کی سطح پہ لانے والے احکامِ قرآن و سنت کو قانونی شکل دے کر ان کی پابندی ضروری اور ان کی خلاف ورزی خلاف قانون قرار دی جائے۔ ان پہ عمل صرف سرمایہ داروں کے جذبہ خیرسگالی پر نہ چھوڑا جائے۔

حرفِ آخر

حضرات! ہمارے معاشرے کے ان محروم طبقوں کے بارے میں قرآنِ حکیم کی روش بیان کرتے وقت نہ تو میں نے کسی استنباط و اجتہاد سے کام لیا ہے اور نہ اس کی تمام تفصیلات میں جانے کی کوشش کی ہے۔ میں نے اس کے صرف سادہ اور صریح احکامات کا ذکر کیا ہے۔ اس گفتگو سے میرا مقصد اربابِ علم و دانش کی توجہ اس رویہ کی طرف دلانا تھا جو قرآنِ حکیم نے ان کی فلاح و بہبود، اصلاح و ترقی سے متعلق اختیار کیا ہے اور وہ مقصد و مدعا بیان کرنا ہے جو وہ اس سلسلے میں اپنے سامنے رکھتا ہے تو میری ان گذارشات کو سننے کے بعد اگر آپ سمجھتے ہیں کہ میں نے اسے صحیح سمجھا ہے اور واقعی قرآنِ حکیم کے نازل کرنے والے کا مقصد و منشا یہی ہے کہ ہم ان لوگوں پر احسان کرنا، انہیں امام و پیشوا بنانا، زمین کے وسائلِ معیشت و اقتدار میں انہیں حصہ دلانا چاہتے ہیں تو قرآنِ حکیم، اس کے نازل کرنے والے، اور اس کے لانے والے کا واسطہ دے کر کہوں گا کہ اصحابِ فکر و دانش کو بالعموم اور علمائے دین کو بالخصوص اس سلسلے میں اپنے فرض کو محسوس کرنا چاہیے۔ وہ نہ صرف اس کے لیے اپنی طاقت ور آواز بلند کریں بلکہ اپنی متفقہ رائے سے معاشرے میں ایسی انقلابی تبدیلیاں لانے کی تدابیر بھی پیش کریں تاکہ یہ محروم طبقات اپنی زندگی ہی میں اپنی کھلی آنکھوں سے نہ صرف دیکھ لیں بلکہ محسوس بھی کر لیں کہ ہاں واقعی اسلام ہم بے نواؤں کا حامی و ہی خواہ ہے اور ان کی جڑ پکڑتی ہوئی یہ غلط فہمی دور ہو جائے کہ دوسرے مذاہب کی طرح یہ مذہب بھی اور اس کے علمبردار بھی سرمایہ داروں کے ایجنٹ، فقراء و مساکین کے دشمن اور انہیں

لوریاں دے دے کر سلانے والے ہیں۔

اور اگر آپ کا خیال ہے کہ میں نے قرآن حکیم کے منشا کو غلط سمجھا ہے۔ طبقہ نسواں واقعی اسی کا مستحق ہے کہ اس کو ہمیشہ جوتے تلے رکھا جائے۔ یتیم اسی قابل ہیں کہ وہ دربدر کی ٹھوکریں کھاتے اور مٹی میں رُلتے رہیں۔ غلاموں کے ان چھوٹے بھائیوں یعنی ملازمین، خدام اور محنت کشوں کا مقدر ہی یہ ہے کہ وہ موت و حیات کے درمیان لٹکتے رہیں۔ وہ لنڈے کے کپڑوں سے اپنے تن ڈھانکیں، فٹ پاتھ کی دال روٹی سے اپنے پیٹ بھریں اور رات کو کسی جوہڑ یا سڑک کے کنارے بنی گھاس پھونس کی جھونپڑیوں میں پڑے رہیں۔ اور انہی حالات میں یہ ان لوگوں کے کاروبار میں بیلوں کی طرح جُتتے رہیں، جو گردشِ زمانہ سے اُونچی کرسیوں پر جا بیٹھے ہیں۔ کیونکہ اگر یہ لوگ خدا کے چہیتے نہ ہوتے تو انہیں یہ رُتبہ کیوں ملتے۔ اسی طرح یہ فقراء و مساکین بھی ہمارے معاشرے کا ناگزیر عنصر ہیں۔ ان کو تا ابد قائم رہنا چاہیے تاکہ ہماری گلیاں ان کی صدائے فی سبیل اللہ سے گونجتی رہیں۔ اور ان کی پھیلی ہوئی ہتھیلیوں پر دو چار سکے رکھ کر دولت مندوں کے جذبۂ اظہارِ دولت کی تسکین ہوتی رہے۔

حضرات! اگر ایسا ہے تو میں نے اتنی دیر تک آپ کو جو زحمت مطالعہ دی ہے، اس پر معذرت خواہ ہوں۔ شکریہ!

اللّٰھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعہ
وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابہ

اسلام میں اختلاف کے آداب

عربی سے ترجمہ و تلخیص از جناب عبد الحی ابڑو صاحب
استاذ شعبہ شریعہ و قانون، عالمی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد

(۱)

۱۔ اختلاف اور متعلقہ اصطلاحات کی تعریف[1]

ا۔ اختلاف اور خلاف: "اختلاف" اور "مخالفت" عربی الفاظ ہیں، جن کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص دوسرے سے اس کے کسی قول یا فعل میں الگ راہ اختیار کرے۔ "خلاف" کے لفظ میں "ضد" (یا عکس) کے مقابلے میں "عموم" پایا جاتا ہے، اس لیے کہ دو "ضد" یا عکس لازمی طور پر ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں، جب کہ دو مختلف فیہ چیزوں کے لیے ضروری نہیں کہ ایک دوسرے کے لیے "ضد" (یا ایک دوسرے کا عکس) بھی ہوں۔ عام طور پر کسی بات میں لوگوں کے اختلاف کا نتیجہ چونکہ جھگڑے اور تنازعہ کی صورت میں نکلتا ہے اس لیے مجازی طور پر "اختلاف" کا لفظ تنازعے اور جھگڑے کے معنی میں بولا جاتا ہے۔ ارشادِ ربانی ہے: فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَیْنِهِمْ (مریم: ۳۷) ترجمہ: "مگر پھر مختلف گروہ باہم اختلاف کرنے لگے" ـــ وَلَا یَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِیْنَ (ھود: ۱۱۸) ترجمہ: "مگر اب تو وہ مختلف طریقوں پر ہی چلتے رہیں گے" ـــ اِنَّكُمْ لَفِیْ قَوْلٍ

---

[1] اس سلسلہ مضامین کا اکثر و بیشتر حصہ ڈاکٹر طہٰ جابر العلوانی کی کتاب "ادب الاختلاف فی الاسلام" کے ترجمہ پر مبنی ہے۔

مُّخْتَلِفٍ (ذاریات: ۸) ترجمہ "تمہاری بات (کفار کی) ایک دوسرے سے مختلف ہے"۔
اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِي بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ۔ (یونس: ۹۳)
ترجمہ: "یقیناً تیرا رب قیامت کے روز ان کے درمیان اس چیز کا فیصلہ کر دے گا جس میں وہ اختلاف کرتے رہے ہیں"۔

اِس بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ "خلاف" اور "اختلاف" سے مراد کسی بات، رائے، حالت و ہیئت یا کسی موقف میں مطلق مغایرت (یا دُوری) ہے۔

فقہاء کے ہاں جو "علم الخلاف" کی اصطلاح مشہور ہے اس سے ایسا علم مراد ہے جس کے ذریعے کسی امام کی استنباط کردہ فقہی جزئیات کو حفظ کیا جاتا ہے اور کسی مخصوص دلیل کے بغیر اس کی مخالف آراء کو رَد کر دیا جاتا ہے، اس لیے کہ اگر ان جزئیات کی پشت پر کوئی دلیل پیش کی جاتی تو ایسا شخص "مجتہد" یا "اصولی" کہلاتا۔ جب کہ "خلافی" (علم الخلاف کے ماہر) کے لیے فرض یہ کیا جاتا ہے کہ اسے فقہ کے دلائل سے سروکار نہیں ہوتا، بلکہ وہ کسی مسئلے کے حکم کے بارے میں صرف اپنے امام کی رائے کو کافی سمجھتا ہے جسے اُس نے اپنی رائے سے تلاش کیا ہے۔ اسی طرح اس کے امام کا قول کسی اور کے قول کو رَد کر دینے کے لیے اس کے ہاں کافی دلیل ہے۔

ب - "جدل" اور "علم الجدل": - جب فریقین میں سے دونوں یا کوئی ایک اپنی رائے یا موقف کو قابلِ لحاظ شمار کرتے ہوئے اس کا دفاع کرے، اور دوسروں سے بھی اس رائے کو منوانے یا اختیار کرانے کی کوشش کرے تو ایسی کوشش کو "جدل" کہا جاتا ہے۔

لغوی لحاظ سے "جدل" کا مطلب ہے: تنازع میں غلبہ حاصل کرنے کے طور پر گفتگو کرنا۔ جب کہ "علم الجدل" سے مراد ایسا علم ہے جس کے ذریعے مختلف فقہی اقوال کے دلائل میں تقابل کر کے قابلِ ترجیح قول کو واضح کیا جائے۔

بعض علماء نے "علم الجدل" کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے: "یہ ایک ایسا علم ہے جس کے ذریعے کسی مطلوبہ غرض کی حمایت و تائید کرنے کی استعداد پیدا ہوتی ہے، چاہے وہ غرض باطل ہی کیوں نہ ہو، اور اس کی مخالف بات کو ساقط کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، چاہے وہ حق ہی کیوں نہ ہو"۔[۱]

---

[۱] دیکھیے مفتاح السعادة ۲/۵۹۹ (مصر)، اور التعریفات للجرجانی ص ۶۶ (مصر)

اِس تعریف میں جدل کے لغوی معنی کا اثر صاف نظر آتا ہے، اس لیے کہ اس تعریف کے مطابق "جدل" ایسا علم ہے جس کی بنیاد مخصوص دلائل پر نہیں، بلکہ یہ ایک ملکہ اور ذہنی استعداد ہے جسے کوئی بھی شخص حاصل کرلے، چاہے وہ قرآن وسنت اور دیگر علوم سے بے بہرہ ہی کیوں نہ ہو۔

ج۔ شقاق: خلاف اور جدل کے بعد اسی سیاق میں ایک اور لفظ بھی استعمال ہوتا ہے اور وہ ہے "شقاق"۔

جب جھگڑے کا شکار ہونے والے فریقین کے مابین تنازعہ شدت اختیار کرجائے، اور دونوں میں سے ہر ایک حق اور راستی کی تلاش کے بجائے صرف غلبہ حاصل کرنا چاہے، اور مفاہمت اور اتفاق رائے مشکل ہو جائے تو ایسی حالت کو "شقاق" کا نام دیا جاتا ہے۔ "شقاق" کے اصلی معنی یہ ہیں کہ: فریقین میں سے ہر ایک کسی جگہ کے الگ الگ شق (حصے) میں ہو، گویا ایک جگہ دونوں کے لیے ناکافی ہو۔ قرآن مجید میں ارشاد ہے: وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا ۔ یعنی تمھیں میاں بیوی کے درمیان ایسے سخت اختلاف کا ڈر ہو کہ جس کے نتیجے میں ایسا تنازعہ پیدا ہوگا جس سے دونوں کی راہ (یا جگہ) الگ الگ ہو جائے گی۔ دوسری آیت میں بھی "شقاق" کا لفظ اسی معنی میں استعمال ہوا ہے: فَاِنَّمَا هُمْ فِيْ شِقَاقٍ ۔

مذموم اور مستحسن اختلاف

مشیتِ ایزدی کا تقاضا تھا کہ لوگوں کو عقل و فہم کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف پیدا کیا جائے۔ ان کی زبانیں، رنگ، سوچ اور فکر کے انداز بھی مختلف ہوں۔ ان کا نتیجہ اختلافِ رائے کی صورت میں برآمد ہونا قدرتی امر تھا۔ جیسا کہ ہماری زبانوں، رنگوں اور اشکال میں تنوع پایا جاتا ہے اور یہ اختلاف قدرتِ کاملہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ اسی طرح ہماری عقلوں، نقطہ ہائے نظر اور ان سے جنم لینے والی آرا کا اختلاف بھی اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے اور اس کی قدرتِ کاملہ پر ایک دلیل ہے۔ بلاشبہ اس کائنات کی تعمیر و ترقی اور اس میں زندگی کا قیام اس صورت میں ممکن نہ تھا اگر تمام انسان ہر چیز میں یکساں پیدا کیے جاتے۔ لیکن اب ہر ایک اپنے اس کام میں مصروف ہے جس کے لیے اُسے تخلیق کیا گیا ہے: وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ وَلِذٰلِكَ خَلَقَهُمْ ۔(ھود: ۱۱۸-۱۱۹)۔ ترجمہ: "اگر تیرا رب چاہتا تو تمام

انسانوں کو ایک گروہ بنا سکتا تھا، مگر اب تو وہ مختلف طریقوں ہی پر چلتے رہیں گے اور بے راہ رویوں سے صرف وہ لوگ بچیں گے جن پر تیرے رب کی رحمت ہے۔"

اسلافِ اُمت کے درمیان جو اختلاف واقع ہوا (جو آج بھی موجود ہے) وہ اس قدرتی مظہر کا ایک حصہ ہے، اگر اختلاف اپنی مقررہ حدود سے تجاوز نہ کر جائے اور اپنے آداب و قواعد کا پابند رہے تو یہ ایک مثبت چیز ہے جس کے بے شمار فائدے ہیں۔

مستحسن اختلاف کے چند فوائد

اگر اختلاف اپنی حدود کے اندر رہے اور اس سے تجاوز نہ کر جائے لوگ اختلاف کے آداب و طریق کار کو اپنا لیں تو اس کے کئی ایک مثبت پہلو ہیں۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

۱- اگر نیت درست ہو تو ایسے اختلاف کے ذریعے ایک ہی معاملے کے کئی پہلو معلوم کرنے میں مدد ملتی ہے، ہو سکتا ہے کہ ان میں سے کچھ کسی طور پر شرعی دلائل پر پورے اُترتے ہوں۔

۲- ایسے اختلاف کے ذریعے اذہان کی ریاضت و مشق ہوتی ہے، آرا کا تبادلہ ہوتا ہے، مختلف عقلیں جن احتمالات تک پہنچ سکتی ہیں ان تک پہنچنے کے لیے غور و فکر کی راہیں کھلتی ہیں۔

۳- ایسے اختلاف کے ذریعے جس شخص کو کوئی واقعہ یا کوئی مسئلہ درپیش ہوتا ہے۔ اس کے سامنے کئی حل ہوتے ہیں، تاکہ ان میں سے جو اسے اس لحاظ سے مناسب لگے کہ دین کی آسانی کے تصور سے قریب تر ہو (اس لیے کہ دین انسانوں کی روزمرہ زندگی میں پیش آمدہ مسائل و واقعات کے [illegible]تا ہے) اسے اختیار کر لے۔

یہ اور اس طرح کے دیگر بے شمار فوائد اختلاف سے اس وقت حاصل کیے جا سکتے ہیں جب اختلاف ان حدود و آداب کا پابند رہے، جن کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔ لیکن اگر ان حدود و قیود کو بالائے طاق رکھا جائے تو یہ اختلاف جھگڑے، ضد اور ہٹ دھرمی کی شکل اختیار کر لیتا ہے جس کے نتائج نہایت ہی خطرناک صورت میں نکلتے ہیں، اُمت میں تفرقہ واقع ہوتا ہے، اور اختلاف تعمیر کے بجائے بگاڑ کا سبب بن جاتا ہے۔

مختلف عوامل کے لحاظ سے اختلاف کی مختلف قسمیں ہیں مثلاً:

خواہشِ نفس کی بنیاد پر اختلاف

کبھی اختلاف کی بنیاد کسی ذاتی مفاد یا غرض کی تکمیل کے لیے

پیدا شدہ نفسانی خواہش ہوتی ہے۔ یا اپنے علم وفہم اور رفعتِ دانی کی نمود و نمائش کا جذبہ اختلاف کا محرک ہوتا ہے، ایسے اختلاف کی تمام شکلیں بُری ہیں۔ اس لیے کہ اس میں خواہشِ نفس کا حصہ تلاشِ حق کے جذبے پر غالب رہتا ہے، جب کہ خواہشِ نفس کبھی بھلائی اور خیر کا سبب نہیں بنتی، اس لیے کہ یہ کفر کی طرف لے جانے والی شیطانی سواری ہے۔

ارشاداتِ ربانی ہیں:

— اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ - (البقرہ: ۸۷)

ترجمہ: "یہ تمہارا کیا ڈھنگ ہے کہ جب بھی کوئی رسول تمہاری خواہشِ نفس کے خلاف کوئی چیز لے کر تمہارے پاس آیا۔ تو تم نے اس کے مقابلے میں سرکشی ہی کی۔ کسی کو جھٹلایا اور کسی کو قتل کر ڈالا۔"

— فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا - (النساء: ۱۳۵)

ترجمہ: "اپنی خواہشِ نفس کی پیروی میں عدل سے باز نہ رہو۔"

— قُلْ لَّآ اَتَّبِعُ اَهْوَآءَكُمْ قَدْ ضَلَلْتُ اِذًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ (الانعام-۵۶)

ترجمہ: "کہو، میں تمہاری خواہشات کی پیروی نہیں کروں گا، اگر میں نے ایسا کیا تو گمراہ ہو گیا، راہِ راست پانے والوں میں سے نہ رہا۔"

— وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ - (ص-۲۶)

ترجمہ: "اور خواہشِ نفس کی پیروی نہ کر کہ وہ تجھے اللہ کے راہ سے بھٹکا دے گی۔"

— وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ - (المومنون-۷۱)

ترجمہ: "اور حق اگر کہیں اُن کی خواہشات کے پیچھے چلتا تو زمین اور آسمان اور ان کی ساری آبادی کا نظام درہم برہم ہو جاتا۔"

— وَاِنَّ كَثِيْرًا لَّيُضِلُّوْنَ بِاَهْوَآئِهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ (الانعام-۱۱۹)

القرون من بعد نوح وکفیٰ بربک بذنوب عبادہ خبیرًا بصیرًا (بنی اسرائیل)
اور آخر میں یہ بھی سن لیجیے کہ قرآنِ حکیم کا یہ لرزا دینے والا فرمان بھی سرمایہ داروں ہی کے بارے میں ہے کہ:
الذین یکنزون الذھب والفضۃ ولا ینفقونھا فی سبیل اللہ فبشرھم بعذاب الیم۔ (التوبہ)
دولت اور دولت مندوں کے اس "ذکرِ خیر" کے بعد آئیے اس طبقہ کی طرف جنہیں قرآن حکیم فقراء و مساکین کے نام سے یاد کرتا ہے۔ سب سے پہلے یہ دیکھیے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس فقر و مسکنت سے نکالنے کا کیا اہتمام کیا ہے۔
۱۔ دولت پر زکوٰۃ لازم کی تو اس کا اولین مصرف انہی کو قرار دیا: انما الصدقات للفقراء والمساکین۔ (التوبہ)
۲۔ مالِ غنیمت اور فئے وغیرہ میں ان کا حصہ رکھا: واعلموا انما غنمتم من شئٍ فان للہ خمسہ وللرسول ولذی القربیٰ والیتامیٰ والمساکین۔ (انفال)
۳۔ زکوٰۃ و صدقاتِ واجبہ کے علاوہ بھی اغنیاء کے اموال میں ان کا حق ٹھہرایا: فی اموالھم حق للسائل والمحروم۔ لفظ حق کو خاص طور پر نوٹ کریں کیونکہ حق وہ ہوتا ہے جو واجب الادا ہو۔
۴۔ اغنیاء کو انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب دینے کے لیے رکوع کے رکوع وقف کر دیئے۔ بلکہ یہاں تک کہہ دیا کہ: لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون کہ جب تک تم خدا کی راہ میں مخلوق کو اپنی محبوب ترین اشیاء نہیں دے دیتے، تمہارے نکوکاری کے دعوے غلط ہیں۔ انفاق فی سبیل اللہ کی تاکید کے ساتھ ساتھ انہیں متنبہ کر دیا گیا کہ اگر انہوں نے ان فقراء و مساکین پر احسان دھرنے یا ان صدقات کی آڑ میں انہیں ذہنی و جسمانی اذیت دینے کی کوشش کی یا انہیں گھٹیا قسم کی اشیاء دے کر حاتم کی قبر پر لات مارنا چاہی تو سارے کئے دھرے پر پانی پھر جائے گا۔ مقصد یہ تھا کہ فقراء و مساکین کی عزتِ نفس مجروح نہ ہو۔ اگرچہ اسلام کسی کے سامنے دستِ سوال دراز کرنا پسند نہیں کرتا۔ لیکن قرآن نے انہیں صراحت کے ساتھ منع نہیں

ایسا نظریہ بلاشبہ خواہش نفس ہی کی پیداوار ہو سکتا ہے، اور اس کی طرف بلانے والا وہی شخص ہو سکتا ہے جس کی زمامِ کار شیطان کے ہاتھ میں ہو۔

۲۔ خواہشِ نفس کی دخل اندازی کو معلوم کرنے کا دوسرا ذریعہ داخلی ہے۔ کسی بھی فکر یا نظریے کے مأخذ کے بارے میں تھوڑی سی سوچ بچار کرنے اور اپنی ذات سے صدق دل سے پوچھ گچھ سے حاصل ہو سکتا ہے۔ اسی طرح یہ بھی معلوم کیا جائے کہ ایسے نظریہ کے حامل شخص کے اردگرد کے حالات کا اس پر کتنا اثر ہے؟ اور اگر یہ حالات تبدیل ہو جائیں تو وہ کس حد تک اپنے اس نظریے پر قائم رہ سکتا ہے؟ کیا کوئی ایسا لاشعوری دباؤ تو موجود نہیں جس نے اسے اس راہ پر چلنے پر مجبور کر دیا ہے؟ اس کے بعد خود اس نظریے کے متعلق تحقیق کی جانی چاہیے۔ اگر اس کے اندر کوئی جھول ہو اور چند جذبات کی بنا پر کبھی مضبوط اور کبھی کمزور ہو جاتا ہو تو سمجھ لیجیے کہ ایسا نظریہ یا نظامِ فکر خواہش نفس کی پیداوار اور شیطانی وسوسہ ہے جس سے خدا کی پناہ مانگنی چاہیے اور اس کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے خواہشاتِ نفس کی رو میں بہہ جانے سے قبل راہِ حقیقت دکھا دی۔

حق کی بنیاد پر اختلاف

کبھی اختلاف ایسا ہوتا ہے کہ جس میں خواہشِ نفس کا کوئی دخل نہیں، ایسے اختلاف کی بنیاد حق پر ہوتی ہے، علم و عقل اس کے متقاضی ہوتے ہیں اور ایمان اسے فرض قرار دیتا ہے۔ جیسے اہلِ ایمان کا کفر، شرک اور نفاق والوں سے اختلاف ایسا فرق ہے جس سے کوئی مسلمان انحراف نہیں کر سکتا اور نہ ہی اسے ختم کرنے کی دعوت دے سکتا ہے، اس لیے کہ اس کی بنیاد ایمان اور حق پر ہے۔ اسی طرح مسلمان کا کافرانہ اور لادینی عقائد رکھنے والوں کے سامنے (جیسے یہودیت، عیسائیت، بت پرستی اور سوشلزم کے سامنے) اختلاف بھی ایسا ہی ہے۔ البتہ ان اقوام اور عقائد کے سامنے اختلاف اس بات میں رکاوٹ نہیں بننا چاہیے کہ اس کے اسباب کو ختم کرنے کی (بذریعہ دعوت) کوشش کی جائے، تاکہ لوگ اللہ کے دین میں داخل ہو جائیں اور اس اختلاف کے اسباب مثلاً کفر، شرک، ہٹ دھرمی، منافقت، برے اخلاق، الحاد و لادینیت، بدعات اور ایسے منکرات کی ترویج و اشاعت کی کوششوں کو چھوڑ دیں۔

اختلاف میں مستحسن اور مذموم دونوں پہلو

یہ ان فقہی جزئیات کے بارے میں اختلاف ہے جن کے حکم کے بارے میں متعدد احتمالات ہو سکتے ہیں، جن میں سے مختلف اسباب اور دلائل کی

روشنی میں کسی ایک حکم کو ترجیح دی جا سکتی ہو (جن کے بارے میں بحث آگے آئے گی) - اس تیسری قسم کی کئی مثالیں ہیں - جیسے کسی زخم سے نکلنے والے خون، یا جان بوجھ کر قے کرنے پر وضو کے ٹوٹ جانے یا نہ ٹوٹنے کے بارے میں اختلاف، یا قراءۃ خلف الامام، فاتحہ سے پہلے بسم اللہ پڑھنے اور آمین زور سے کہنے کے بارے میں علماء کا آپس میں اختلاف اور اس طرح کی بے شمار مثالیں۔ اختلاف کی اس قسم میں لغزشِ فکر کا بڑا امکان ہے، اس لیے کہ اس میں ممکن ہے کہ خواہشِ نفس تقویٰ کے ساتھ، علم ظن و تخمین کے ساتھ، راجح مرجوح کے ساتھ اور مردود مقبول کے ساتھ مِل جُل جائے۔ اِن خطروں سے بچنے کی صورت یہی ہے کہ ایسے قواعد و ضوابط کی پابندی کی جائے جنہیں اختلاف کی صورت میں فیصل بنایا جا سکے، اور جو اس اختلاف کو کنٹرول کریں۔ ورنہ اختلاف، ضد، ہٹ دھرمی اور جھگڑے کی صورت اختیار کرے گا۔ اور فریقین تقویٰ کے مقام سے خواہشِ نفس کے گڑھے میں جا گریں گے۔ بے ہنگم پن نمودار ہوگا۔ اور شیطان کو اپنے سینگ اُٹھانے کا موقع ملے گا۔

اختلاف کے بارے میں علماء کی رائے

ان تمام باتوں کے باوصف، چند علمائے اُمت نے اختلاف کی تمام اقسام سے بچنے کی تاکید کی ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: "اختلاف شر ہے"[1]۔ امام سبکی رح فرماتے ہیں:

"...... رحمت کا تقاضا یہ ہے کہ اختلاف نہ ہو، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وَلٰكِنِ اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ - (البقرۃ-۲۵۳)

ترجمہ: "مگر انہوں نے باہم اختلاف کیا، پھر کوئی ایمان لایا اور کسی نے کفر کی راہ اختیار کی"۔

اسی طرح سنتِ رسول میں بھی یہی ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے:

"بلاشبہ بنی اسرائیل کثرتِ سوال اور اپنے انبیاء کے ساتھ اختلاف کی وجہ سے ہلاک ہوئے"۔

اس بارے میں بے شمار آیات و احادیث موجود ہیں۔ امام سبکی رح نے اختلاف کی تیسری قسم (جو ذم و استحسان دونوں کی حامل ہو سکتی ہے) کی تین قسمیں بیان کی ہیں۔ فرماتے ہیں: "........ اختلاف کی تین

---

[1] العواصم من القواصم ص ۸۰، [2] المحصول للرازی جلد ۲ ق ۱ ص ۴۸۰

قسمیں ہیں۔ پہلے بنیادی اصول میں اختلاف، اسی کا ذکر قرآن مجید (کی پچھلی آیات) میں وارد ہوا ہے۔ بلاشبہ ایسا اختلاف بدعت و گمراہی ہے۔ دوسرے آراء اور جنگوں کے بارے میں اختلاف، یہ بھی ناجائز ہے، اس لیے کہ اس کی وجہ سے اُمت کے مفادات کو نقصان پہنچتا ہے۔ تیسرے فروع اور جزئیات میں اختلاف، جیسے کسی چیز کے جائز یا ناجائز وغیرہ ہونے میں اختلاف[1]۔ جس کے بارے میں (ان کی رائے کے مطابق) اتفاق رائے سے بہتر ہے۔ امام سبکیؒ نے یہاں اختلاف کی مذمت میں امام ابن حزم ظاہریؒ کے ایک قول کا بھی حوالہ دیا ہے، جس میں انہوں نے کسی بھی اختلاف کو "رحمت" نہیں کہا، بلکہ تمام اختلافات کو عذاب ہی قرار دیا ہے۔

اختلاف کے نقصانات اور خطرات کو جاننے کے لیے یہ جاننا کافی ہے کہ خدا کے نبی ہارون علیہ السلام نے اختلاف کو بتوں کی عبادت سے زیادہ خطرناک اور ضرر رساں شمار کیا ہے۔ جب سامری نے اپنی قوم کی پوجا کے لیے سونے کا ایک بچھڑا تیار کیا اور انہیں کہا کہ "یہ (معاذ اللہ) تمہارا اور موسیٰؑ کا معبود ہے۔" تو حضرت ہارونؑ نے خاموشی اختیار کرلی اور اپنے بھائی (موسیٰؑ) کی آمد کا انتظار کرتے رہے۔ جب موسیٰؑ آئے اور قوم کو بچھڑے کی عبادت میں مشغول پایا تو اپنے بھائی کو سخت ملامت کی۔ یہاں اُن کے بھائی نے یہ عذر پیش کیا کہ: "اے میری ماں کے بیٹے! میری ڈاڑھی نہ پکڑ، نہ میرے سر کے بال کھینچ، مجھے اس بات کا ڈر تھا کہ تو آکر کہے گا کہ تم نے بنی اسرائیل میں پھوٹ ڈال دی، اور میری بات کا پاس نہ کیا" (طٰہٰ: ۹۴)۔ تو حضرت ہارون نے قوم کے افتراق اور اختلاف کو اس بات کا عذر بنا کر پیش کیا کہ وہ اس کے اندیشے سے انہیں زیادہ سختی سے نہ روک سکے اور مقابلہ نہ کیا۔

(باقی)

---

[1] الابہاج ۳/۱۳

مومن کے خصائل

جناب سید اسعد گیلانی صاحب - ایم - اے

ایک مسلمان کے لیے اسلام کو صرف تسلیم کر لینا ہی کافی نہیں ہے - فی الحقیقت اسے اسلام کی اطاعت کرنے سے ہی حقیقی اور سچا مسلمان کہا جا سکتا ہے - اسلام مسلمانوں کی ایک خاص انداز میں تربیت کرنا چاہتا ہے تاکہ وہ دُنیا میں اصلاحِ انسانیت کے خصوصی فرائض سرانجام دے سکے - اسلام مسلمان کو خالقِ کائنات کی اطاعت گزار مخلوق بنانا چاہتا ہے - وہ اسے شعور کے ساتھ خالقِ کائنات سے وابستہ کرنا چاہتا ہے -

اِس کائنات کی سب سے بڑی حقیقت یہ ہے کہ اِس کائنات کا ایک خالق ، مالک ، آقا اور پروردگار ہے اور وہی اس کا مستحق ہے کہ اس کی بندگی اور پرستش کی جائے اور اس کی مخلوق کا اس کے ساتھ سب سے سچا اور حقیقی تعلق بھی یہی ہے کہ وہ اپنے مالک اور خالق کی بندگی اور اطاعت کرے - اس بات کو خالق و مالک نے اپنی کتاب میں خود بیان کیا ہے -

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ o

"ہم نے جنوں اور انسانوں کو اپنی بندگی کے لیے پیدا کیا ہے"

چنانچہ انسانی زندگی کے تمام کاموں میں سب سے بڑا اور اہم کام یہی ہے کہ کائنات کے خالق کی اطاعت و عبادت کی جائے اور انسانی کارناموں میں سے سب سے بڑا کارنامہ بھی یہی ہے کہ دُنیا کے لوگوں کو مالک کے آگے جھک جانے اور اس کی بندگی بجا لانے کی دعوت دی جائے - بندگیٔ رب کی دعوت دینے والوں میں سب سے زیادہ محترم ، معزز اور مقدس گروہ انبیاء کا گروہ

رہا ہے جس کے افراد اپنے اپنے دور اور اپنی اپنی قوموں میں مسلسل اور پیہم آتے رہے ہیں اور ایک ہی بات کی طرف سارے انسانوں کو بار بار دعوت دیتے رہے ہیں۔

یٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ

"اے برادرانِ قوم اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارا کوئی خدا نہیں ہے۔"

اس طرح انسانوں میں سب سے زیادہ معزز، معتبر، محترم اور مقدس گروہ انبیاء کے کام کا مرکزی نکتہ ہمیشہ یہی رہا ہے کہ انسانوں کو خدا کی بندگی کی طرف بلایا جائے، اس لیے کہ کائنات کی سب سے بڑی صداقت یہی ہے کہ انسان خدا کا بندہ اور غلام ہے اور انسانوں کی طرف سے اس حقیقت کا اعتراف سب سے بڑی صداقت کا اعتراف و اظہار ہے۔ یہی دعوت انبیاء کے ساتھی یا ان کے راستے پر چلنے والے صالحین بھی اپنے اپنے وقت میں دیتے رہے ہیں۔ اس لیے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ خدا کی نظر میں انسانیت کی ہدایت، رہنمائی اور بھلائی کا سب سے بڑا کام یہی ہے کہ انسانوں کو خدا کی بندگی کی طرف بلایا جائے۔ سائنٹیفک دریافتیں، مشینوں کی ایجاد، تعلیمی اور رفاہی ادارے، امدادی انجمنیں، امن کی سلامتی اور لوگوں کی بہبود کے سارے کام بھی اسی صورت بامعنی نتیجہ خیز اور انسانیت کی حقیقی خدمت کا ذریعہ بن سکتے ہیں جب خدا کی ہدایت اور اطاعت کے ساتھ ہوں، ورنہ فساد کے بے شمار راستے پیدا ہو جاتے ہیں۔ غرض دعوتِ دین کے اس کام کے آگے دوسرے سارے کام ہیچ و لیپت اور دوسرے درجے کے کام ہیں۔ خدا کی نظر میں سب سے اعلیٰ و ارفع اور دنیا و آخرت میں انسانیت کی بھلائی اور بہبود کا عظیم کام بندگیٔ رب کی طرف خدا کے بندوں کو دعوت دینا ہے۔ مسلمان کو ایک ملت اور گروہ کی حیثیت سے اسی کام کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ اسی لیے قرآن نے مسلمانوں کو مخاطب کر کے کہا ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ۔

"تم وہ بہترین گروہ ہو جسے خلقِ خدا کی ہدایت کے لیے اٹھایا گیا ہے، تاکہ تم انسانوں کو نیکی کا حکم دو، برائیوں سے روکو، اور خدا کی اطاعت کا کلمہ بلند کرو۔"

اِس مقصد کے لیے انبیاء کی تربیت تو اللہ تعالیٰ اپنے مخصوص ذرائع سے خود کرتا ہے، کبھی انفس و آفاق میں آیاتِ الٰہی دکھا کر، کبھی فرعون کے گھر میں پرورش کے بعد، پھر بکریاں چروا کر، کبھی کنویں اور جیل کے راستے سے تختِ شاہی تک پہنچا کر، اور کبھی غار و ہجرت کے مراحل طے کر کے، غلبۂ نظامِ اسلامی تک لے جا کر۔ لیکن انبیائے کرام کے بعد جن لوگوں نے بھی دعوتِ حق کا کام کرنا ہو، انہیں ایک خاص نوعیت کی صلاحیت پیدا کرنے کے لیے ایک مخصوص طرز کی تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ تربیت علمی بھی ہوتی ہے اور عملی بھی۔ اس کے بغیر دعوتِ دین کا کام احسن طریقے سے سرانجام دینا ممکن نہیں ہے۔ اسلام یہ دونوں قسم کے خصائل مسلمان میں پیدا کرنا چاہتا ہے۔

علمی صلاحیت

کوئی شخص جب تک یہی نہ جانتا ہو کہ حق کیا ہے اور اس کا معیار کیا ہے، اس کی شناخت اور اس کی پہچان کیا ہے؛ اس کے خدوخال اور اس کا حدود اربعہ کیا ہے۔ وہ کس چیز سے منع کرتا ہے اور کون سا کام کرنے کا حکم دیتا ہے، اس وقت تک اس کے لیے نہ یہ معلوم کرنا آسان ہے کہ حق کیا ہے اور نہ دوسروں کو باور کرانا ممکن ہے کہ وہ حق ہی پیش کر رہا ہے، حق کے نام پر کوئی اور چیز نہیں پیش کر رہا ہے۔ اس لیے دعوتِ دین کے لیے حق طلبی، حق شناسی، حق آگاہی اور حق پرستی ساری صفات ضروری ہیں جو شخص دعوتِ دین کا یہ کام کرنا چاہے اُسے اپنے اندر کچھ صلاحیتوں کو پیدا اور بیدار کرنا ضروری ہے چنانچہ علمِ حق کا حصول مسلمان کے لیے لازم ہے۔

احساس و شعور کی بیداری

ایک مسلمان کے لیے پہلے ہی قدم پر یہ احساس و شعور بیدار کرنا بھی انتہائی ضروری ہے کہ وہ ایک فلاحِ انسانیت پر مبنی نظام کا نمائندہ ہے اور دین کی دعوت لے کر اُٹھا ہے۔ اس لیے اسے سب سے پہلے اس دین کو اپنی ذات پر بھی نافذ کرنا ہے۔ یہ اس سے اس کے دین کا سب سے پہلا تقاضا ہے۔ اگر وہ دین کے اس مطالبے کو پورا کرنے سے عاری ہے تو جس جس پہلو سے وہ دین کا تقاضا پورا نہیں کرتا، اس اس پہلو سے اس کی دعوت کا مخاطب بھی اس کی دعوت کی طرف سے غیر متاثر، بے نیاز اور بے پروا رہتا ہے، اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنی ذات کو حق کی ترازو میں تولے، اور اس کی کمی بیشی کو پورا

کرنے کی اپنی سی کوشش کرے۔ اپنی طرف دیکھنا، اپنی ذات پر خود گرفت کرنا اور اپنی ذات کو لاکر اپنے ضمیر کے سامنے کھڑا کرنا اور ضمیر کی ترازو میں تولنا دعوتِ حق کا آغاز ہے۔ یہ ایسے ہی ہے کہ جیسے کوئی شخص جہاد پر جانے سے پہلے اسلحہ کی جانچ پڑتال کرے۔ غرض اس کے لیے ایک باشعور اور بیدار مغز ضمیر مطلوب ہے اور بیدار ضمیر کی پہچان یہ ہے کہ وہ نیکی پر خوش ہوتا اور بدی پر آزردہ اور نادم ہوتا ہے۔ مسلمان کا ضمیر بیدار ہونا چاہیے۔

حضرت عمرؓ کا اپنی بہن فاطمہؓ سے مار پیٹ کا واقعہ ان کے اندر احساس وشعور کی کروٹ کا واقعہ تھا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ ان کی کمزور بہن جو کبھی ان کی کسی بات کے سامنے اُف نہیں کرتی تھی، ایک خاص معاملہ میں ان کے سامنے ڈٹ گئی ہے۔ اور یہ تک کہہ گزری ہے کہ "عمر جو چاہے کر لو لیکن اب اسلام دل سے نہیں نکالا جاسکتا"۔ تو اُن کی بہن کا یہ پُرعزیمت جملہ اور ناقابلِ شکست رویہ ان کے اندر احساسِ غیر کی بیداری کا باعث بن گیا۔ اُن کے اندر عمر فاروق نے کروٹ لی۔ اور انہوں نے محسوس کیا کہ اسلام کوئی خاص چیز ہے جس نے ان کی بہن کو اتنا قوی کر دیا ہے کہ وہ اب اپنے بھائی کی پروا کرنے سے بھی بے نیاز ہے۔ اپنی بہن کی یہی جرأت آمیز بات ان کے اندر قبولِ حق کے لیے چنگاری کا کام کر گئی۔ اس کے علاوہ اگر کوئی شخص حضورؐ اکرم کے ارشاد کے مطابق اپنے پانچ نکاتی جائزے کا خود اہتمام کرے کہ:

— وہ اپنی عمر عزیز کس کام میں صرف کر رہا ہے؟

— اپنا علم کس مقصد کے لیے کام میں لا رہا ہے؟

— اپنی آمدنی کو کہاں کہاں سے سمیٹ رہا ہے؟

— اپنی آمدنی کو کس کس راستے میں صرف کر رہا ہے؟

— اور اس کی جسمانی اور ذہنی توانائیاں کس کس جگہ کام کر رہی ہیں اور یہ کہ ان سب چیزوں میں اس کے خدا کا کتنا حصہ ہے۔

تو یہ جائزہ ہی اس کے اندر اخلاصِ نیت، خشیتِ الٰہی اور دینِ حق کے لیے کام کرنے کا عزم پیدا کر دے گا۔ اور وہ ذہنی طور پر دنیا میں ایک مسلمان کی حیثیت سے کام کرنے کی خوبی سے آراستہ ہو جائے گا۔

نیت کی درستی احساس کی بیداری کے بعد ایک مسلمان کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اللہ کے دینِ اسلام کے لیے کام کرنے کی نیت اور ارادہ کرے جب تک آدمی نیت کرکے خدا کے کام کی طرف رجوع نہ کرے اُس کا دل و دماغ اور اس کی توانائیاں سمتِ منزل اور ہدف سے محروم رہتی ہیں۔ اسلام میں نیتِ خیر کا مسئلہ عملِ خیر سے پہلے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ نیت کی خوبی عملِ خیر کو تقویت پہنچاتی ہے۔ اس میں خلوص اور بے لوثی پیدا کرتی ہے۔ اس کام کو بہتر انجام تک پہنچاتی اور انسان میں عزم اور صبر پیدا کرتی ہے۔ نیت کے بغیر کوئی بھلائی بھی پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتی۔ اس لیے ایک مومن کو یہ طے کرنا بہت ضروری ہے کہ وہ اپنے اللہ کی بندگی کی دعوت اللہ کے بندوں تک پہنچانا چاہتا ہے۔ اور اس کے اللہ کا اس کے ذمے یہ حق ہے کہ جسے ادا کیے بغیر اس کا فریضۂ بندگی ادا نہیں ہوتا۔ یہ وہ اجتماعی کام ہے جسے سرانجام دیے بغیر انفرادی نیکی میں بھی استحکام اور استقلال پیدا نہیں ہوتا۔ ایک داعی میں یکسوئی کے ساتھ یہ جذبہ شدید ہونا چاہیے کہ وہ اپنے مالک کے دین کی دعوت اس کے تمام بے خبر اور گم کردہ راہ بندوں تک پہنچائے گا۔ اور اس میں اپنی بہترین صلاحیتیں اور قوتیں بہترین انداز میں کھپائے گا۔ اس راستے میں آنے والی مشکلات سے ہرگز نہیں گھبرائے گا۔ اس لیے کہ مشکلات تو راستے کا زادِ راہ ہیں، مصائب اس راستے کا زادِ سفر ہیں۔ اور مخالفتیں اس راستے کا دستور ہیں۔ غرض ایک مسلمان اور ایک داعیِ حق کی پہچان یہی ہے کہ وہ حق و صداقت کا پیغام لے کر خدا کے بندوں کی طرف جاتا ہے۔ اور اگر ان کی طرف سے مزاحمت، مخالفت گالی گلوچ، مار پیٹ، اور پتھر بھی برسیں تو وہ ان سب کو برداشت کرتا ہوا نتائج کو اپنے مالک کے حوالے کر دیتا ہے اور اس کام سے کسی رکاوٹ کے سبب بھی کبھی باز نہیں آتا۔

(باقی)

اِسلام کا تصوّرِ تعلیم

جناب پروفیسر سید محمد سلیم صاحب

مغرب کی لادینی اور مادی تہذیب کے اثرات ہمارے مسلمان معاشرے پر بھی پڑے ہیں۔ مادی تہذیب میں تعلیم کا مفہوم مختلف علوم و فنون کی معلومات حاصل کرنا ہے۔ امتحان پاس کر کے سندات حاصل کرنا ہے۔ تاکہ کوئی اچھی نوکری، اچھا کاروبار اور عمدہ روزگار مل سکے۔ جس کے بعد عیش و آرام سے زندگی گزرے۔ تعلیم دنیوی زندگی میں کامیابی حاصل کرنے کا ایک زینہ ہے۔ کامیابی کا مفہوم ان کے یہاں مادی آرام، آسائش اور سہولت سے زیادہ نہیں ہے۔ ان کے یہاں زندگی کا تصوّر بھی خالص مادی ہے۔ ان کے نزدیک موت کے بعد زندگی ختم ہو جاتی ہے۔

اسلام کے نزدیک تعلیم کا تصوّر مغربی تصوّر سے بالکل مختلف ہے۔ کیونکہ دونوں طرف زندگی کا مفہوم یکسر مختلف ہے۔ انسان اصلاً رُوحانی مخلوق ہے۔ مادی جسم اس کو اس لیے ملا ہے کہ رُوح اپنی کارکردگی کا اظہار کر سکے۔ انسان دُنیا میں اللہ تعالیٰ کا خلیفہ ہے۔ ساری مخلوقات کے مقابلے میں انسان کو علم اور اختیار کی قوتوں سے نوازا گیا ہے۔ اپنی ساری مخلوقات پر اقتدار بخشا ہے۔ کارِ خلافت انجام دینے کے لیے انسان کو ذہنی اور جسمانی بے شمار صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ مقصود یہ ہے کہ انسان اپنے علم و اختیار سے اللہ تعالیٰ کا مطیع و فرمانبردار بندہ بن کر رہے۔ اپنی تمام صلاحیتوں کو خداوند تعالیٰ کی اطاعت و فرمانبرداری میں صرف کرے۔ صلاحیتوں اور قوتوں کو تعمیری کاموں میں صرف کرے۔ پُرامن معاشرہ، اخلاق و عدل و انصاف پر مشتمل ایک تہذیب اور ایک حق پرستانہ تمدن کو فروغ دے۔

دُنیا انسان کے لیے ایک میدانِ عمل ہے۔ صلاحیتوں کے اظہار کی جگہ ہے۔ دُنیا انسان کے لیے ایک چیلنج بھی ہے کہ آیا اپنی صلاحیتوں کو وہ تعمیری کاموں میں اطاعتِ خداوندی میں صرف کرتا ہے اور دُنیا میں امن و سکون سے بہرہ ور ہوتا ہے یا وہ اپنی صلاحیتوں کو نفس پرستی و خود غرضی میں اور خداوند تعالیٰ کی نافرمانی میں صرف کرتا ہے۔ دُنیا کو ظلم و جور سے بھر دیتا ہے۔ اپنی دُنیا بھی خراب کر لیتا ہے اور اپنی عاقبت بھی بگاڑ لیتا ہے۔

اسلام کے نزدیک تعلیم انسان کی ناگزیر ضرورت ہے۔ جس طرح کھانا پینا ضرورت ہے۔ تعلیم انسان کو حیوانیت کے درجے سے بلند کر کے انسانیت کی سطح پر لے آتی ہے۔ شرفِ انسانیت سے ہمکنار کرتی ہے۔ اخلاقی اور روحانی اقدارِ حیات سے آشنا کرتی ہے۔ یہ ایسی تعلیم ہے جو اس دُنیا میں انسان کی حیثیت متعین کرتی ہے کہ وہ نرا حیوان نہیں ہے بلکہ اشرف المخلوقات ہے خلیفۃ اللہ فی الارض ہے۔ زندگی گزارنا نہ تو مجبوری ہے نہ عیاشی ہے، بلکہ امتحان ہے، آزمائش ہے۔ اس امتحان کا نتیجہ دوسری دُنیا میں، مرنے کے بعد، آخرت میں سُنایا جائے گا۔ پھر یا ہمیشہ کی کامیابی جنت یا ہمیشہ کی ناکامی دوزخ۔ اِس تصور کے تحت اصل زندگی آخرت کی زندگی ہے اور عیش و آرام کا موقع بھی آخرت کی زندگی میں ہے۔ دُنیا کی زندگی تیاری کی زندگی ہے۔ آزمائش اور امتحان کی زندگی ہے۔ اسلامی نظامِ تعلیم میں انسان کو زندگی کا مفہوم اور مطلب بتایا جاتا ہے۔ اعلیٰ اور ارفع مقصد --- آخرت میں کامیابی! اور اسی کے نقطۂ نظر سے تیاری کے طور طریقے سکھائے جاتے ہیں۔

زندگی کا یہ تصور اور تعلیم کا یہ تصور انسانی عقل کی پرواز سے ماورا ہے۔ انسان کی خوگرِ محسوس عقل کی اڑان اتنی بلندی پر نہیں جا سکتی۔ چنانچہ خالقِ کائنات اور خالقِ انسان خداوندِ کریم کی کرم نوازی نے یہ تعلیم دی ہے۔ یہ وحی الٰہی کا عطیہ ہے۔ یہ نیابتِ الٰہی ہے جو انبیائے کرام کے توسط سے انسانوں کو ملی ہے۔ جس کو اور قومیں تو گم کر بیٹھیں، لیکن مسلمان کے پاس ہدایتِ الٰہی مکمل شکل میں محفوظ ہے۔ یہ قرآنِ مجید ہے۔ ہدایتِ الٰہی کا مکمل اور آخری نسخہ۔

قرآنِ مجید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دینی تعلیم کو ہر مسلمان مرد اور عورت کے لیے لازمی قرار دیا ہے۔ یہ تعلیم فرضِ عین ہے۔ ہر فرد کے لیے ضروری ہے۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ مقصود بالذات

ہے۔ دوسرے کسی مقصدِ دُنیا کا ذریعہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

— "ان سے پوچھو، علم والے اور بے علم، کیا دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ — (زمر۔ ۹)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

— ہر مسلمان مرد ہو، عورت ہو، آزاد ہو یا غلام، اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ فریضہ عاید ہوتا ہے کہ وہ ضرور کچھ نہ کچھ قرآن جانے اور کچھ دینی مسائل سمجھے۔ (تفسیر قرطبی، جلد ۳ ص ۱۲۱)

تعلیم و تربیت اسلام کے نزدیک کوئی کاروبار یا کوئی پیشہ نہیں ہے، بلکہ کارِ عبادت ہے۔ تعلیم و تدریس میں مشغول استاد اور شاگرد دونوں گویا کارِ عبادت میں مشغول ہوتے ہیں اور اجر و ثواب کے مستحق ہوتے ہیں۔ حضورؐ فرماتے ہیں:

— طالب علم کی خوشنودی کے لیے اللہ کے فرشتے راہ چلتے وقت طالب علم کے سامنے اپنے پَر بچھا دیتے ہیں۔ (ابوداؤد)

— خیر کی تعلیم دینے والے استاد کے حق میں ہر چیز مغفرت کی دُعا کرتی ہے۔ (ترمذی)

— استاد اور شاگرد اجر میں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔ (ابن ماجہ)

اِن احادیث کی روشنی میں یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلامی تصورِ حیات کے مطابق ہر ایک مسلمان کے لیے خواہ وہ مرد ہو یا عورت، تعلیم سے بہرہ ور ہونا ضروری ہے۔ پہلے مرحلے میں یہ والدین کی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنی اولاد کو علم کے زیور سے آراستہ کریں۔ حضورؐ نے فرمایا ہے:

— والدین کا بہترین عطیہ اولاد کی صحیح تربیت کرنا ہے۔ (ترمذی)

— بیٹے کا باپ پر یہ حق ہے کہ وہ اس کا اچھا سا نام رکھے، لکھنا پڑھنا سکھائے اور بالغ ہونے کے بعد اس کی شادی کرے۔ (جامع الصغیر)

— جب بچے سات سال کی عمر کو پہنچ جائیں تو اُن کو نماز کا حکم دو۔ دس سال کی عمر کو پہنچ جائیں تو (نماز نہ پڑھنے پر) اِن کی فہمائش کرو اور جُدا جُدا بستروں پر سلاؤ۔ (مسند ابن حنبل)

— جو والد اپنے لڑکے کو قرآنِ مجید کی تعلیم دلاتا ہے، قیامت کے روز جنت میں اس کو تاج پہنایا جائے گا۔

والدین کے بعد یہ ذمہ داری اسلامی ریاست اور اسلامی معاشرے پر عاید ہوتی ہے کہ وہ ملک میں اسلامی تعلیم کے حصول کا انتظام کریں۔ ملک میں مکاتب اور مدارس کا نظام اتنی وسعت کے ساتھ رائج کریں کہ کوئی مسلمان دینی تعلیم حاصل کرنے سے محروم نہ رہے۔ اگر کہیں یہ سہولتیں حاصل نہیں ہیں تو وہاں کا مسلمان معاشرہ اور اسلامی حکومت دونوں قابلِ مواخذہ ہیں۔ خداوند تعالیٰ کے یہاں ان کی گرفت ہوگی۔

اُوپر کے بیان سے یہ بات واضح ہوگئی ہے کہ اسلام کے نزدیک تعلیم کا مفہوم بہت وسیع ہے۔ اس کے کئی اجزا ہیں، مثلاً:

۱۔ تدریس: کتاب پڑھانا۔ علم سکھانا۔

۲۔ تربیت: گفتار، کردار اور اطوار کو علم کے متعلق استوار کرنا، سانچے میں ڈھالنا۔

۳۔ تادیب: آدابِ زندگی اور اقدارِ حیات سکھانا۔ نافرمانی پر سرزنش کرنا۔

۴۔ تدریب: علوم و فنون میں مشق و مہارت حاصل کرنا۔

۵۔ تلقین: وعظ و نصیحت سے اخلاقی تعلیم دینا۔

۶۔ امر بالمعروف و نہی عن المنکر: نیکیوں کو پھیلانا اور بُرائیوں کو روکنا۔

ایک مسلمان ساری زندگی میں معلّم بھی ہوتا ہے اور متعلّم بھی ہوتا ہے۔ سیکھتا بھی رہتا ہے اور سکھاتا بھی رہتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

— گہوارہ سے لے کر گور تک علم کی تحصیل کرتے رہو۔

سیکھنے اور سکھانے کا صرف ایک ہی طریقہ نہیں ہے کہ اُستاد شاگرد کو کتاب پڑھائے، بلکہ کتاب پڑھانا، اخلاق سنوارنا، اخلاقِ حسنہ سے آراستہ کرنا، اور اخلاقِ مذمومہ سے محترز رکھنا، گفتار، کردار اور رفتار کے آداب سکھانا۔ فنون میں مہارت پیدا کرنا۔ عوام کو وعظ و نصیحت کرنا، بُرائیوں اور غلط کاریوں کا سدِّباب کرنا، اور اس کی جگہ نیکیوں اور بھلائیوں کو فروغ دینا، سب تعلیم کے اندر آتے ہیں۔ درحقیقت اسلام کے نزدیک تعلیم کے وسیع تر تصور کے تحت سارا مسلمان معاشرہ ایک درس گاہ ہے جس میں ہر شخص معلّم بھی ہے اور متعلّم بھی ہے۔ چلتے پھرتے

اُٹھتے بیٹھتے بزرگ تعلیم دیتے رہتے ہیں۔ ذرائع ابلاغ، ٹی وی، ریڈیو، اخبارات، رسالے، اشتہارات سیمینار، سب تعلیم دیتے رہتے ہیں۔ وعظ، تقریر، جلسہ یہ سب تعلیم ہے۔ غرضیکہ ساری زندگی انسان تعلیم دیتا بھی ہے اور تعلیم لیتا بھی ہے۔ سیکھتا بھی ہے اور سکھاتا بھی ہے۔ یہ تعلیم زبان سے بھی ہے اور عمل سے بھی ہے، نظر سے بھی ہے، دیکھنے سے بھی ہے اور سننے سے بھی ہے۔ اس کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ اس وسیع تر دائرہ تعلیم میں، اس ہمہ وقت اور ہمہ جہت تعلیم گاہ میں، معاشرہ میں ایک ایک شخص استاد ہے اور ایک ایک شخص شاگرد ہے، اور اس استاد کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

۔ خیر کی تعلیم دینے والے اُستاد کے حق میں دُنیا کی ہر چیز مغفرت کی دُعا کرتی ہے۔ (ترمذی)

یہاں "خیر کی تعلیم دینے والے" الفاظ اہمیت کے قابل ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس ہمہ جہتی اور ہمہ وقتی درس گاہ میں چند لوگ خیر کی تعلیم دینے والے ہیں اور چند دوسرے لوگ شر کی تعلیم دینے والے ہیں۔ اب صرف مغفرت کی دُعا اُن کے حق میں کی جاتی ہے جو خیر کی تعلیم دے رہے ہیں۔ جو شر کی تعلیم دے رہے ہیں، ان کے حق میں مغفرت کی دُعا نہیں کی جا رہی ہے۔ اُن کا تو سخت محاسبہ ہوگا۔ ان کو سخت ترین سزا دی جانے والی ہے۔ وہ فسادِ معاشرہ پیدا کر رہے ہیں، جو بُرائی، بد اخلاقی اور بے حیائی کو فروغ دے رہے ہیں۔

اِس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اسلام کا تصورِ تعلیم بہت وسعت رکھتا ہے۔

شخصیت

مولانا محمد نصر اللہ خاں خازن

(زندگی پر ایک سرسری نظر)

جناب نور الٰہی صاحب ایڈووکیٹ - گجرات

مولانا محمد نصر اللہ خاں خازن مرحوم سابق مہتمم جامعہ عربیہ احیاء العلوم کٹھالہ ضلع گجرات کی عمر ۶۰ سال کے قریب تھی۔ ان کا آبائی وطن موضع سیکریالی ضلع گجرات تھا۔ جہاں انہوں نے عربی اور فارسی کی تعلیم اپنے والدِ محترم مولانا رحمت علی خاں ساقی سے حاصل کی اور انگریزی کی تحصیل کے لیے گجرات شہر کا رُخ کیا۔ اور بعد ازاں نقلِ مکانی کر کے گجرات شہر میں مستقل سکونت اختیار کی۔ فکرِ معاش کے سلسلے میں موصوف کراچی گئے اور وہیں ۱۹۵۱ء میں جماعتِ اسلامی پاکستان کے رکن بنے۔ ۱۹۵۵ء سے ۱۹۵۸ء تک مرکزی مکتبۂ جماعت اسلامی پاکستان کے مینجر رہے۔ وہاں سے فارغ ہو کر بلال ٹنریز اور سروس انڈسٹریز گجرات میں بطور اکاؤنٹنٹ ملازمت کرتے رہے۔ اس دوران میں جماعتِ اسلامی شہر گجرات کی امارت کے فرائض بھی انجام دیتے رہے اور عربی کتب کے اردو ترجمہ کا کام بھی کرتے رہے۔ سید قطب شہید کی کتاب "مشاہد القیامۃ فی القرآن" کا ترجمہ "مناظرِ قیامت۔ قرآن کی زبان میں" ان کا شاہکار ترجمہ ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ مرحوم نے اس کا مقدمہ تحریر فرماتے ہوئے لکھا:

> "محترم نصر اللہ خاں کہ اَلْوَلَدُ سِرٌّ لِاَبِیْہِ کے مصداق اپنے بزرگوں کی وراثتوں کے امین ہیں۔ خاندانی روایت کو سنبھالے ہوئے ہیں، چنانچہ "مشاہد القیامۃ فی القرآن" کا یہ ترجمہ (مناظر قیامت۔ قرآن کی زبان میں) اس کا بیّن ثبوت ہے۔

ایک مترجم کی سب سے بڑی مشکل یہ ہوتی ہے کہ اُسے دو کشتیوں میں سوار ہو کر دونوں زبانوں میں عمق اور تبحر حاصل کرنا پڑتا ہے۔ جو مترجم ان اوصاف کا حامل نہیں وہ ترجمے کا حق ادا کر ہی نہیں سکتا۔

محمد نصر اللہ خاں نے دو کشتیوں میں سوار ہو کر دونوں پر اپنی یکساں کامل گرفت کا ثبوت مہیا کیا ہے۔ اس سے ترجمے میں توازن اور دلکشی پیدا ہوتی ہے۔ کتاب کو پڑھیے ترجمے کا احساس ہی نہیں ہوتا۔ اصل کا لطف حاصل ہوتا ہے۔ روانی، بے ساختگی، ادا اور بیان میں کسی جگہ رکاوٹ، جھول اور تردد محسوس نہیں ہوتا۔ میں نے زندگی میں بہت ترجمے دیکھے اور پڑھے ہیں، ایسا کامل اور معنی خیز ترجمہ بہت کم دیکھا ہے۔"

مرحوم کو عربی علوم سے بے پناہ محبت تھی۔ اسی لیے انہوں نے مصر میں انڈسٹریز سے فراغت حاصل کرلی اور گجرات شہر میں جامعہ عربیہ احیاء العلوم کی بنیاد رکھی۔ بعدازاں اس درس گاہ کے لیے صوفی مہدی حسنؒ نے ایک قطعۂ اراضی موازی ۴ کنال بمقام کٹھالہ جی ٹی روڈ کے کنارے عطا کیا۔ یہاں جامعہ کی موجودہ عمارت قائم ہے۔ مرحوم اس جامعہ کے مہتمم تھے اور یہ ان کے اعمالِ حسنہ کی یادگار ہے۔

خازنؔ مرحوم جس زمانہ میں لاہور میں تھے اسی دوران میں وہ ملک نصر اللہ خان عزیزؔ کے ہمراہ روزنامہ "تسنیم" اور "ایشیا" کے نائب مدیر کے طور پر بھی کام کرتے رہے۔ آپ اُردو، عربی اور فارسی کے انشا پرداز تھے۔ عربی کے شاعر بھی تھے اور خازنؔ تخلص کرتے تھے۔ انھوں نے مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ مرحوم کا مرثیہ بھی عربی نظم میں تحریر کیا۔ جو ماہنامہ "سیارہ" میں چھپا۔ خازنؔ مرحوم اپنے تدریسی فرائض آخری وقت تک سرانجام دیتے رہے اور کمزوریٔ صحت کے باوجود عربی کتابوں کے ترجمہ کا کام بھی کرتے رہے۔ درج ذیل کتابوں کے تراجم ان کی یادگار ہیں:

۱۔ مناظرِ قیامت (از سید قطب شہید)

۲۔ حکومتِ الٰہیہ (از علامہ خمینی)

۳۔ سیرتِ تابعین

۴۔ تسہیل المنطق (ترتیب)

مرحوم نہایت نیک نفس، خلیق و ملنسار اور متواضع و حلیم تھے۔ ان کی وفات سے جامعہ عربیہ احیاء العلوم کے لیے بہت بڑی کمی واقع ہوگئی ہے۔ لیکن ع

اکنوں چہ تواں کرد کہ تقدیر چنیں بود

مرحوم کی وفاتِ حسرت آیات مورخہ ۸ دسمبر ۱۹۸۶ء کو ۶ بجے صبح کے وقت ہوئی۔ اہالیانِ گجرات نے اس سانحہ کو شدت کے ساتھ محسوس کیا اور مقامی لوگوں کی کثیر تعداد نمازِ جنازہ میں شریک ہوئی۔ علاوہ ازیں ضلع کے دیگر مقامات سے بھی رفقاء اور جامعہ عربیہ گوجرانوالہ کے سٹاف کے ارکان بھی پہنچ گئے۔ نماز جنازہ مولانا فتح محمد صاحب امیر جماعت اسلامی صوبہ پنجاب نے پڑھائی اور عصر کے وقت اس مجموعۂ خوبی کے جسد خاکی کو سپردِ خاک کر دیا گیا۔

فرمان خداوندی ہے:

"اسی زمین سے ہم نے تم کو پیدا کیا۔ اسی میں ہم تمہیں واپس لے جائیں گے اور اسی سے تم کو دوبارہ نکالیں گے" (طٰہٰ - ۲۰)

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کی لغزشوں سے درگذر فرمائے۔ انہیں اپنے خصوصی فضل و کرم سے نوازے اور اپنی نعمتوں بھری جنت میں اعلیٰ مقام عنایت فرمائے۔ اللہ تعالیٰ مرحوم کے پسماندگان کو صبر جمیل عطا کرے اور ان کے صاحبزادگان، محمد ظفر اللہ خان ایم اے، محمد شکر اللہ خاں اور محمد نعیم اللہ خاں کو اپنے باپ دادا کے علم و فضل کا وارث بنائے۔

ایں دعا از من و از جملہ جہاں آمین باد

رسائل و مسائل

بیوٹی پارلر کھولیں یا نہیں!

مولانا عبدالمالک صاحب - منصورہ - لاہور

سوال :-

۱- میں بیوٹیشن کا کورس کر کے بیوٹی پارلر کھولنا چاہتی ہوں - معلوم یہ کرنا ہے کہ آیا اس کی کمائی جائز ہے یا نہیں - کیونکہ اس میں میک اپ کیا جاتا ہے۔

۲- کیا بال کاٹنا گناہ ہے اگر چٹیا موجود ہو، صرف سامنے سے تھوڑی سی لٹیں

سلہ بہن فہمیدہ سید صاحبہ سادا میک اَپ ہی نہیں کیا جاتا جیسے کہ آپ نے معصومانہ انداز میں لکھا ہے بلکہ حدیث میں جو واضح ہدایات عورتوں کے بالوں اور بھنوؤں اور آرائشوں کے متعلق ہیں - ان کی خوب اچھی طرح خلاف ورزی ہوتی ہے - نیز جسم کے ممنوع الکشف حصوں کو دوسروں کے سامنے کھولا جاتا ہے اور نوبت حمام کرنے تک بھی پہنچتی ہے - پھر اس تمدّن کا پیدا کردہ ایک خاص مقصد "جسم پرستی" اور "حُسن کا جنون" ذہنوں پر حاوی ہوتا ہے، اور جنسی اُمور میں نظر فریبی کے طریقے پھیلتے ہیں - عورتیں ایسے مقامات پر جمع ہو کر نئے دَور کی بے تکلفی کے تحت قابلِ اخفا اُمور پر ایسے ایسے انداز سے گفتگوئیں کرتی ہیں کہ اُن کی فطری دولتِ حیا کا بہت زیاں ہوتا ہے - خاص طور سے ایسی جگہیں کھاتے پیتے اور اُونچے گھرانوں کی بیگمات جمع ہوتی ہیں - اور ان کے درمیان غریب یا کمزور درمیانہ طبقے کی عورتیں آ پھنسیں تو وہ سخت مرعوبیت اور احساسِ کمتری کا شکار ہو جاتی ہیں - اور شریفانہ مزاج کی نوعمر لڑکیاں (طالبات وغیرہ) تو کئی منازل بیوٹی پارلر میں طے کر لیتی ہیں - اِن

(باقی بر صفحہ آئندہ)

کاٹ دی جائیں تو یہ بھی ناجائز ہے؟

جواب: جو کام جائز ہو اُس کی اُجرت جائز ہوتی ہے اور جو کام ناجائز ہو یا ملا جلا ہو اُس کی آمدن بھی ناجائز ہوتی ہے اس لیے ہمارا مشورہ یہ ہے کہ آپ بیوٹی پارلر کھولنے کا ارادہ ترک کر دیں کیونکہ اس میں زیادہ تر ناجائز کاموں کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے اور اس کی خاطر آپ جو کورس کرنا چاہتی ہیں اس کا خیال بھی دل سے نکال دیں۔

(بقیہ صفحہ گذشتہ)

اڈوں پر غلط راستوں پر ڈالنے والی عورتیں بھی بہکا دینے کے لیے آ پہنچتی ہیں۔ کورس کے ساتھ ساتھ آپ متعلقہ احادیث اور کچھ اور دینی لٹریچر بھی پڑھیں۔ (مدیر)

مطبوعات

حمد و مناجات | مرتبین: ضیاء محمد ضیاء و طاہر شادانی۔ ناشر: علمی کتب خانہ، کبیر سٹریٹ، اُردو بازار، لاہور۔ ۳۵۰ صفحات کی کتاب، خوبصورت، رنگین، دبیز سرورق کے ساتھ۔ قیمت: ۲۴/ روپے۔

نوعمری میں ایک کتاب معارفِ ملت میرے مطالعہ میں رہی جس میں حمدیہ، مناجاتی، نعتیہ، ملی اور قومی نظمیں جمع تھیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس کے کئی حصے ہیں اور شاید دیکھے بھی۔

سچے عقیدے اور جذبات جو کسی معاشرے میں پائے جاتے ہوں، کوئی چاہے نہ چاہے، وہ شعر و ادب میں اپنا راستہ بنا لیتے ہیں۔ اس لحاظ سے بہت سے عنوانات اور احساسِ مسرت و درد کے ایسے نئے پہلو ہیں جو مسلمان معاشرے نے برِصغیر کی بولیوں کو دیئے۔ خاص طور سے اُردو نے اِن نئے اثرات کو اپنایا اور پروان چڑھایا بلکہ کہنا چاہیے کہ مقامی مشترک بھاشا اسی صورت میں ترقی کی راہ پر بڑھی جب کہ اس نے نئے خیالات و احساسات کو جذب کیا۔ یہاں تک کہ اُردو زبان نِکھرتی گئی۔

عربی، فارسی کے بعد برِصغیر کی بولیوں خصوصاً اُردو کو مسلمانوں کا دیا ہوا ایک بڑا موضوع حمد و مناجات کا ہے جس کی امتیازی شان توحید ہے۔ اور توحید کے ساتھ صفاتِ الٰہیہ کے وہ تصورات جن کی تعلیم قرآن اور نبیٔ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دی۔ بلکہ ایک تیسری چیز اور بھی شامل ہے۔ خدا اور بندے کے تعلق کی نوعیت اور اس سے پیدا ہونے والے مخصوص جذبات و احساسات یہ بھی ہمارے حمدیہ اور مناجاتی شعر و ادب میں پائے جاتے ہیں۔

اُردو شعر و ادب میں شروع سے جو اسلامی عنصر داخل ہوا ہے وہ چاہے پوری طرح

دُنیائے نگارش پر تسلط یافتہ نہ ہو، لیکن دوسری طرف انفرادیت پسندی، دُنیا پرستی، تعیش پسندی، اخلاقی بغاوت، جنسی ہیجانات اور بہ حیثیت مجموعی مادہ پرستانہ رجحانات جو آہستہ آہستہ اُبھرتے آرہے تھے اُن کو ایک تو ساتھ ساتھ اسلامی عنصر نے حد سے تجاوز کرنے سے روکے رکھا، دوسری طرف جب مذہب دشمنی اور خدا سے بغاوت اور جنسی جنون محض استثنائی انفرادی عدم توازن کی مثالیں نہ رہ گئیں، بلکہ ایک ترقی پسند انقلابی تحریک نے ان ساری بلاؤں کو جانِ ادب بنانے کا فیصلہ کر لیا تو اُردو ادب کا اسلامی عنصر ہی آڑے آیا۔ اور وہ تحریک بکھر گئی۔

اس پس منظر کو ملحوظ رکھ کر ہم اس مجموعۂ حمد و مناجات کا دلی خیر مقدم کرتے ہیں۔

یہ مجموعہ اوّلاً اس لحاظ سے قابلِ قدر ہے کہ اس کے ہر دو مرتبین تعلیم و تدریس سے تعلق رکھنے والے اور بجائے خود شعر گوئی میں مقام رکھتے ہیں۔ نیز اہلِ مطالعہ کی اس پُرانی صف کے باقیات میں سے ہیں، جو بہت پڑھتے تھے اور جو کچھ پڑھتے تھے اُسے لفظ بہ لفظ ہی نہیں، نقطہ بہ نقطہ اور خط بہ خط سمجھتے تھے۔ غنیمت ہے کہ آج یہ احباب ہمارے درمیان ہیں۔

جبکہ "اچھے مطالعہ" کا عہد ختم ہو رہا ہے۔ اوّل تو نئی نسلیں پڑھنے سے بے تعلق ہیں، پڑھ کر کوئی سُنائے تو یہ نہیں جانتیں کہ کیا پڑھا گیا ہے! آج کے نوجوانوں کے پاس گھر میں ٹیلی وژن، سڑکوں اور بس سٹینڈوں پہ نظر بازی اور کھیل کے میدانوں میں ہاکی اور کرکٹ کے مشاغل اتنے زیادہ ہیں کہ "لفظ" کا وجود اس زمانے کی بے اعتنائیوں سے نالہ کناں ہے۔

معمول کے خلاف اتنی زیادہ عبارت لکھ دی، مگر اصل باتیں رہی جاتی ہیں۔ مرتبین کا ذوقِ نظر پَر لگا لگا کر ہر اُس گوشے تک اُڑا جہاں اُن کے موضوع کا کوئی کوئی چمکتا ذرّہ ان کو دکھائی دیا۔ زمانے کے لحاظ سے قدیم و جدید سب کو انھوں نے جمع کر دیا۔ اصناف کے لحاظ سے غزل، مخمس، مسدس، مستزاد، تضمین، ترجیع بند، رباعی، چوبیتی وغیرہ کتنے ہی سانچوں میں ڈھلا ہوا مضمونِ واحد سامنے آیا۔ پھر شعرا کی فہرست بنائیں تو ہر عمر، ہر علاقے، ہر نسل اور ہر پیشے کے اصحاب اس محفل میں جمع ہیں۔ جو زندہ ہیں وہ زندہ ہیں، جو فوت ہو گئے وہ بھی یہاں زندہ ہیں۔

کڑے انتخاب اور جائزہ کلام کے لحاظ سے مرتبین کا علم، مطالعہ اور ذوق پکی سند ہیں۔

یہ کتاب میرے پاس ریویو کے لیے نہیں آئی تھی مگر اس سے متاثر ہو کر میں نے یہ سطور لکھ دی ہیں۔

جستجوئے منزل از ملک مشتاق احمد صالح - ناشر: الخدمت پچنند، تلہ گنگ -
قیمت: ۲۰/- روپے -

یہ ایک طرح کی خود نوشت ہے، اپنے ہی سفرِ زندگی کی داستان، اور یہ جس خلوص اور صداقت سے بیان کی گئی ہے میں اس کا پورا اعتراف کرتا ہوں - اس نوجوان کی میری نگاہوں میں بڑی قدر ہے جس نے کسی تصنع سے کام لیے بغیر اپنی عمر کے نصف بیشتر حصے کی روئیداد اس طرح بیان کی ہے کہ تلہ گنگ کا ثقافتی ماحول، وہاں کے تمام ادارے، تمام رسمیں اور بہت سے کردار کی تصویریں تیار ہو گئی ہیں - بظاہر جبر فیانِ ادب کی نگاہ میں اس کتاب کی کوئی وقعت ادبی معیارات کے حساب سے ہو گی یا نہیں، ہم اسے ایک نوجوان کا غنائی ادب کہہ سکتے ہیں - اس نوجوان نے بچپن سے مطالعہ کا جو ذوق حاصل کیا ہے اس کی مدد سے اُردو کا بہت سا ذخیرہ الفاظ و تشبیہات جمع کیا اور ان کے کئی طریقہ ہائے استعمال سیکھے اور برتے - ساتھ ہی ساتھ جہاں اس کی قوتِ اظہار نے پسند کیا، بدھاں مقامی پنجابی الفاظ یا اصطلاحات سے بے دریغ مدد لی - اس تحریر کے آئینے میں جو کردار ہمارے سامنے آتا ہے وہ اپنی اندرونی اُمنگوں اور ماحول کے مسائل کی دھیمی کشمکش سے دوچار ہے اور اس کے ذہن میں جن اُصولوں نے جگہ پکڑی ہے، ان میں سے بیشتر اچھے ہیں - یہی وجہ ہے کہ اس کردار کے دینی جذبات اس طرح چمکتے ہیں جیسے ریت میں ابرق کے ذرّے - مگر یوں معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی شخصیت کے لیے کوئی انتہائی منزل و مقصد اور اس کا راستہ واضح طور پر متعین نہیں کر سکا ہے - لیکن اس کمی کے پورا ہو جانے کی اُمید کی جا سکتی ہے -

---

تعلیمی انحطاط کے اسباب از پروفیسر سید محمد سلیم - ناشر: ادارۂ تعلیمی تحقیق، ۸-اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور - قیمت: ۶/- روپے -

آج ہمارا خوفناک مسئلہ عمومی انحطاط ہے، اخلاقی انحطاط، معاشی انحطاط، صنعتی انحطاط، فرض شناسی کا انحطاط، نظم و نسق کا انحطاط، دیانت و امانت کا انحطاط وغیرہ -
اور ایک بڑا انحطاط تعلیمی انحطاط ہے، جس کے زیرِ اثر دوسرے کئی دائروں میں بھی انحطاط

پیدا ہوتا ہے یا بڑھتا ہے، مگر جہاں ساری توجہ ہنگامہ اور تخریبی مسائل پہ ہو وہاں ایک خاموش ٹھنڈے اور تعمیری کام کا خیال بھی کسی کو آئے تو بڑی بات ہے۔

سید محمد سلیم صاحب کا ایک مستقل موضوع تحقیق و کاوش تعلیم ہے۔ وہ تعلیم کے فکری اور عملی اور تاریخی پہلوؤں پر کئی قابلِ قدر کتابیں لکھ چکے ہیں۔ اس چھوٹی سی کتاب میں انہوں نے تعلیمی انحطاط کے خوفناک مسئلے کا جائزہ لیا ہے، جسے وہ قومی خسارا کہتے ہیں۔ سید صاحب بتاتے ہیں کہ کیکر کا یہ درخت (مغربی نظامِ تعلیم) ۱۸۳۵ء میں لگایا گیا تھا، علی گڑھ کالج کے قیام کے بعد مسلمانوں نے اسے قبول کیا، اب اس کیکر کے کانٹے جو شروع میں اس کے پتوں کی طرح ملائم تھے کپڑے پھاڑ کر (اور زخم لگا کر) اپنا وجود تسلیم کرا رہے ہیں۔

اِس کتاب میں اسلامی نظریۂ تعلیم، برصغیر کی مختصر سی تاریخ تعلیم اور اس کی بنائی ہوئی ذہنیتوں کے بیان کے ساتھ، نصاب، امتحانات، اساتذہ، فیسوں کے نظام، ٹیوشن، رخصتوں اور کھیلوں کی کثرت اور طلبا کے آمرانہ انداز وغیرہ اسباب و عوامل کی وضاحت مدبرانہ انداز سے کی ہے۔

حضرت ابوذر غفاریؓ | از جناب عبدالشکور۔ ناشر: عارف پبلیکیشنز، ۹۵- ارنا چلم روڈ، بنگلور- انڈیا- کاغذ و طباعت نفیس- قیمت: ۱۲/- روپے- آئندہ یہ کتاب مکتبہ تعمیر انسانیت اُردو بازار، لاہور سے بھی شائع ہو گی۔

حضرت ابوذرؓ کی شخصیت صحابہ کرام کی مجلس میں ایک امتیازی مقام رکھتی ہے۔ انہوں نے دین کے اُس تعلیمی حصے پر خاص توجہ دی جس میں دُنیا اور دولتِ دُنیا اور عشرتِ دُنیا کی محبت پر نکیر کی گئی ہے۔ انہوں نے اپنے قبیلے کے ماضی کے تکلیف دہ حالات بھی دیکھے تھے، انہوں نے مدینہ میں مسلمانوں کی تنگ حالی بھی دیکھی اور خود اس دَور کی اذیتوں کو دوسروں سے زیادہ بھگتا۔ پھر جب مسلمانوں میں خیبر، ایران، روم و شام سے دولت کی ندیاں بہتی ہوئی آنے لگیں تو اس عبرت ناک منظر کو بھی آپ نے دیکھا۔ حضرت ابوذرؓ کی نظر برابر اس بات پر تھی کہ دولت اور اخلاق یا دُنیا اور آخرت کس طرح ٹکراتے ہیں۔ اور کس طرح ان میں توازن رکھنا مشکل ہو رہا ہے۔ اور روز بروز مشکل تر ہوتا

جائے گا ۔۔۔ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیش گوئی کے مطابق یہی ہوا کہ دُنیا مسلمانوں پر سوار ہو گئی ۔ حضرت ابوذرؓ کی صدائے احتجاج شروع میں دھیمی تھی اور پھر بڑھتی گئی ۔ یہاں تک کہ معاشرے میں ان کا وجود قابل برداشت نہ رہا ۔ اور ان کو مقامِ زنداں میں بھیج دیا گیا ۔ جہاں ان کی وفات ہوئی ۔

ہر تجزیہ نگار کو یہ ضرور خیال رکھنا چاہیے کہ دین کے کسی ایک گوشے پر اگر ساری توجہ صرف کر دی جائے تو اس سے "انتہا پسندی" اور لاینحل الجھنیں پیدا ہوتی ہیں ۔ زندگی کے سارے مسائل، سارے احوال اور سارے قضیوں کو سامنے رکھ کر فکر و عمل کی راہیں نکالنی چاہئیں ۔

تو یہ کتاب اس مردِ عظیم حضرت ابوذر غفاریؓ کی سوانح حیات سامنے لاتی ہے ۔ اہم واقعات، خاص خاص ارشاداتِ رسولؐ، خود حضرت ابوذرؓ کے بیان کردہ نکات و کلمات، اس کاغذی خزانے کے موتی ہیں ۔

میں نے روس میں کیا دیکھا | از انجینئر شاہ محمود خاں رکن انسٹی ٹیوٹ آف ریجنل اسٹڈیز پشاور

ناشر: ادارہ معارفِ اسلامی، لاہور ۱۸ ۔ سفید کاغذ ۔ صفحات: ۳۷۵ ۔ رنگین و دبیز سرورق ۔
قیمت: ۶۰/- روپے

سفر نامہ آج کی اہم صنفِ ادب ہے ۔ بہت سفر نامے قدیم و جدید پڑھے ۔ رُوس کے متعلق بھی مخالفین و موافقین کی سیاحی کی روداد یں نظر سے گذریں ۔ مگر شاہ محمود خاں کا سفر نامہ بس ۔۔۔ لیکن تو چیزے دیگری ! نہ افسانوی باتیں ہیں، نہ رومانی چوچلے ہیں، سچی حقیقت نگاری ہے مگر افسانہ سے دلچسپ ۔۔۔ سادہ تحریر ہے مگر لفظی آبگینہ تراشیوں سے زیادہ پرکشش ۔۔۔ انجینئر محمود خاں ستمبر ۷۸ء میں انجینئری کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے روس گئے اور ۶ سال کا زمانہ وہاں گذارا ۔ شہر سے دیہات تک، ماسکو سے وسط ایشیا کے مُسلم علاقوں تک سب دیکھ ڈالا ۔ عوامی سطح پر بھوک اور عام ضروریات کی کمی کا جو سماں انھوں نے پیش کیا ہے وہ پون صدی کے مکمل اشتراکی تجربے کی ناکامی کی تصویر پیش کرتا ہے ۔ کتاب بتاتی ہے کہ وہاں جا کر کئی مسلمان بالمقابل مولانا ظفر علی خان

"خمر و خنزیر و زن" کے گھن چکر میں بری طرح تباہ ہوتے ہیں۔ اور عورت کی تذلیل کے مناظر تو خون رلا دیتے ہیں۔ قدم قدم پر عورتیں روٹی اور شراب کے لیے ہر نوجوان کے گلے پڑتی ہیں۔ پھر اونچے طبقے کے جداگانہ دائرۂ حیات کی عیاشیوں کے بالمقابل عام لوگوں کی محرومیوں کا یہ سماں ہے کہ بعض دیہات میں لوگ ایسے جھونپڑوں میں رہتے ہیں، جہاں مویشیوں کو رکھنا بھی ظلم ہے۔ پھر اسلام کو کچلنے کے لیے ظلم و استبداد کی جو کارروائیاں کی گئی ہیں ان کے علی الرغم مسلمانوں کے سینوں میں دین کی چنگاریاں موجود ہیں۔ وہاں لوگ مسلم سیاحوں یا طلبہ سے قرآن حاصل کرنے یا ایک آدھ آیت لکھا کر پاس رکھنے کے لیے بے تاب ملتے ہیں۔ پھر اس سرمایہ داروں اور امریکہ کے دشمن ملک کی آبادی پر امریکہ کی اشیاء کے حصول کا جو جنون سوار ہے اور جس کے لیے وہ ہر نووارد کے آگے روبل اور ڈالر پھینک کر اس پر جھپٹتے ہیں، وہ ایک طرح کی امریکہ پرستی ہے۔ بازاروں ہوٹلوں، تعلیم گاہوں، ہسپتالوں، اسٹوروں کی لمبی قطاروں، بسوں اور ہوائی جہازوں کی سیٹوں پر رشوت کے چلن وغیرہ کا حال آپ اصل کتاب میں دیکھیں۔

اسے پڑھنے کے بعد کوئی اندھا آدمی ہی کمیونسٹ یا روس پرست ہو سکتا ہے۔

THE FACTOR IN ECONOMIC & FINANCIAL TRANSACTIONS

از سید حامد عبدالرحمٰن الکاف۔
شائع کردہ: اسلامک ریسرچ اکیڈمی، فیڈرل بی ایریا۔ کراچی۔ صفحات: ۱۱۶۔ قیمت: ۲۰/- روپے

انگریزی زبان میں لکھی ہوئی اس کتاب کا پورا نام (DOES ISLAM ASSIGN ANY VALUE/WEIGHT TO TIME FACTOR IN ECONOMIC AND FINANCIAL TRANSACTIONS? ——— بہت طویل ہے۔ ترجمہ یہ ہے کہ "آیا اسلام اقتصادی اور مالیاتی لین دین میں عاملِ وقت کو کوئی وزن یا قدر دیتا ہے؟

میں اس کتاب کو اس خیال سے روکے ہوئے تھا کہ کبھی تفصیل سے اس پر اپنے حامیانہ احساسات

کا اظہار کروں گا۔ مگر کتابوں کا سیلاب مسلسل بڑھتا چلا آرہا ہے۔ سید الکاف نے نہ صرف دورِ حاضر کے مروج سودی معاملات کی بعض اشکال کا تجزیہ کیا ہے، بلکہ نصوصِ اسلامی، سنّت، تعامل صحابہ، اور تعبیراتِ ائمہ سے ثابت کیا ہے کہ وہ تمام ادھار کا کاروباری لین دین جس میں وقت کی کمی بیشی کے ساتھ مدیون کو کم و بیش کی ادائیگی کرنی پڑتی ہو، ہزار پیرائے بدلنے کے بعد بھی ناجائز ہے۔ یہ موقف ایک مجاہدانہ موقف ہے اور میں اپنی اصول پسندانہ طبیعت کے تحت حامد الکاف صاحب کے موقف اور شدتِ احساس سے بہت متاثر ہوں۔ اشارۃً انہوں نے بعض سودی طریقہائے کاروبار کی متبادل صورتیں بھی اجمالاً بیان کی ہیں۔

بہرحال سود کے خلاف ان کے جہاد کی حمایت کرنا ہر اس شخص کی ذمہ داری ہے جو سود کی شدید حرمت کا علم رکھتا ہو۔

قافلۂ انسانیت کی منزلِ مقصود

رسولِ اکرمؐ

مرتبہ

سیدہ اُمِّ فاروق

بہ مصطفیٰ بہ رساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ اُو نہ رسیدی تمام بولہبی ست

- عالمِ نسواں کے لیے رسولِ اکرمؐ کی حیاتِ طیبہ میں رہنمائی کے خطوط۔
- خواتینِ جہاں کے لیے حقوق کا منشور اور فرائض کے نقوش۔
- رسولِ اکرمؐ کی ازدواجی زندگی، پسند و ناپسند اور ذوقِ لطیف کے خدوخال

ضخامت: ۲۴۰ صفحات ○ سائز: ۲۳ × ۳۶ / ۱۶

زیرِ طبع۔

طلب فرمایئے۔ کالج کی طالبات کے لیے تحفہ

ادارہ ترجمان القرآن (پرائیویٹ) لمیٹڈ۔ رحمان مارکیٹ اُردو بازار۔ لاہور